ڈاکٹر ذاکر حسین

کچھوا اور خرگوش

الفیلسوف الھندی
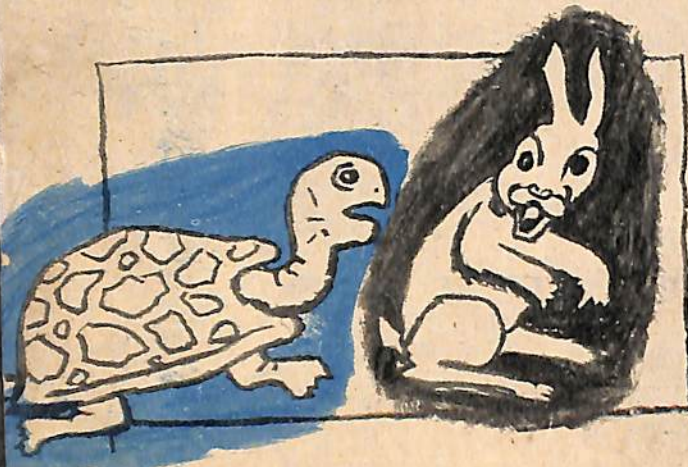
نیشنل بُک ٹرسٹ اِنڈیا

کچھوا اور خرگوش

حکومتِ ہند

پہلا ایڈیشن

سنہ اشاعت: ۱۹۷۰

یہ کتاب منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ یوتھ سروسیز، حکومتِ ہند
کی ہندوستانی زبانوں میں کتابوں کی تصنیف، ترجمہ اور اشاعت
کی اسکیم کے تحت نصف خرچ فراہم کر کے ترقّیِ اُردو بورڈ کے
اہتمام میں شائع کی گئی۔

کچھوا اور خرگوش

ڈاکٹر ذاکر حسین

ترقیِ اُردو بورڈ منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ یوتھ سروسیز، حکومتِ ہند
کے اہتمام میں شائع کی گئی

ناشر:۔ نیشنل بک ٹرسٹ۔ انڈیا۔ نئی دہلی

مارچ ۱۹۷۰ (چیترا ۱۸۹۲)

قیمت:۔ عام ایڈیشن ۱/۰
لائبریری ایڈیشن ۲/۰

KACHHWA AUR KHARGOSH
(URDU)

سیکریٹری نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے لبرٹی آرٹ پریس۔ دریا گنج دہلی
سے چھپوا کر شائع کیا

پیش لفظ

حکومتِ ہند نے اُردو زبان میں کتابیں تیار اور شائع کرنے کے لئے ترقیِ اُردو بورڈ قائم کیا ہے۔ یہ بورڈ اس اسکیم کے تحت قائم کیا گیا ہے جس کا مقصد ہے کہ یونیورسٹیوں، علمی انجمنوں، مصنّفوں، مترجموں، اُستادوں اور ناشروں کے اشتراک و تعاون سے عام سائنس کی کتابوں، بچّوں کی دلچسپی کی اور یونیورسٹی کی سطح کی معیاری کتابوں کو تصنیف کرائے اور دوسری زبانوں سے مستند کتابوں کے ترجمے شائع کرے۔

منسٹری آف ایجوکیشن اینڈ یوتھ سروسیز کے اہتمام سے "کچھوا اور خرگوش" کتاب نیشنل بُک ٹرسٹ کی وساطت سے شائع ہو رہی ہے۔ اُمّید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب طالب علموں، استادوں اور ان تمام لوگوں کے حلقے میں پسند کی جائے گی جنھیں ایک قومی زبان کی حیثیت سے اُردو کی بقا اور ترقی سے دلچسپی ہے۔

وی۔ کے۔ آر۔ وی راؤ

منسٹر آف ایجوکیشن اینڈ یوتھ سروسیز

چیرمین

ترقیِ اُردو بورڈ

مصوّر: ایم۔ایف۔حسین

کچھوا اور خرگوش

۵

راجدھانی دلّی سے کوئی پانچ میل پر ایک چھوٹا سا گانوں ہے اوکھلا۔ جمنا سے لگا ہوا سمجھو۔ پہلے لوگ دلّی سے مچھلیاں پکڑنے آتے تو یہی اُن کا ٹھکانا تھا۔ پھر کوئی بیس پچیس برس ہوئے کچھ سرپھرے دیوانے سے لوگ یہاں آکر بسنے لگے اور ایک مدرسہ سا بنانے لگے۔ ناسمجھ سے تو تھے ہی پر نہ جانے کیا لگن تھی کہ بے سروسامان اس گانوں کے پاس ایک کھُلے میدان میں انھوں نے ڈیرے ڈال دیے۔ پلّے نہ پیسہ نہ کوڑی، اور بڑے بڑے مکان بنانے شروع کر دیے۔ پُورے کیسے ہوتے۔ برسوں ایسے مکانوں میں آپ بھی رہے اور مدرسے کے بچّوں کو بھی رکھا جن کے دروازوں میں کواڑ تک نہ تھے۔ ہَوا ایک طرف سے اِس بڑی عمارت میں گھُستی تو دوسرے سرے تک

گاتی سیٹیاں بجاتی چلی جاتی۔ مگر یہ تھے کہ ڈٹے رہے۔ دیکھنے میں بھولے بھولے نادان سے
لگتے تھے یہ لوگ پر تھے دُھن کے پکّے اور مست مگن۔ جمے رہے، تو ان کا کام بھی جمتا گیا، بڑھتا
گیا۔ اب وہاں بہت بڑا مدرسہ کھڑا ہو گیا ہے۔ دُور دُور سے لڑکے اور لڑکیاں پڑھنے آتے
ہیں۔ بڑے بڑے عالم اور ماہر اس میں پڑھاتے سکھاتے ہیں۔ کتابیں لکھتے ہیں، لکچر دیتے
ہیں۔ فرصت میں پُرانے دنوں کا ذکر آجاتا ہے تو ہنس لیتے ہیں۔ کوئی کوئی دو ایک
فقرے بھی کس دیتا ہے۔ دیوانوں پر فرزانے بھی نہ ہنسیں تو کون ہنسے اور وہ بھی اُن پر
فقرے نہ کسیں تو کون کسے۔ سچ ہے ہر آدمی کی دنیا الگ الگ ہوتی ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی
دنیا میں خوش رہتا ہے۔ پُرانے زمانے میں بھی لوگ ان پر ہنسا کرتے تھے۔ دیوانوں پر کون
نہیں ہنستا۔ اور یہ خود ایسے مست تھے کہ آپ بھی اپنے اوپر اور اپنی بے سروسامانی پر جی
کھول کر ہنس لیتے اور دوسروں کو بھی ہنسا لیتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کچھ لوگ کہیں باہر سے اُن کا حال سن کر ان کا کام دیکھنے آئے۔
کام وام تو ایسا کیا تھا اور ہوتا بھی تو کام کوئی ایسے چلتے پھرتے کیسے دیکھے۔ یہ لوگ اصل میں
یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کچھ پونجی پیسا ہے کہ نہیں۔ مدرسے کی عمارت ہے کہ نہیں۔ ایسا تو نہیں
کہ کسی دن یہ مست "ہو" کر کے اٹھ کھڑے ہوئے تو بس مدرسہ ودرسہ سب ختم۔ تم جانو لوگ تو
پائداری چاہتے ہیں۔ اور سنا ہے کہ پائداری بڑے بڑے مکانوں اور بہت سے روپے

سے ہوتی ہے۔ ہاں۔ تو کچھ لوگ اس مدرسے کو دیکھنے آئے۔ مدرسہ دکھانے کے لیے اس مدرسے کے ایک استاد اُن کے ساتھ تھے، جن پر دیوانگی اور سرمستی کا رنگ دوسرے ساتھیوں سے کچھ چوکھا ہی تھا۔ یہ عینک لگائے، کندھے پر اپنا لمبا سا رومال لٹکائے، کھدّر کی صدری پہنے، جدھر سے نکل جاتے ان کی مسکراہٹ دیکھ کر پھول، پتّے، جانور، آدمی سبھی کھِل جاتے۔ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے۔

کہاں کی بات کہاں پہنچی جاتی ہے۔ ہاں۔ تو یہ مست قلندر ان لوگوں کو مدرسہ دکھانے دلّی سے ان کے ساتھ ہو لیے۔ تانگے پر آئے تھے۔ مدرسے کے سامنے اُترنے کی جگہ یہ ساتھیوں کو اوکھلے کی نہر کے پُل پر لے گئے۔ بڑی پُر فضا جگہ ہے۔ ایک طرف جمنا، ایک طرف اس کی پانی سے لبریز نہر، ایک چھوٹا سا پُل، اس کے آگے پانی روکنے کو لکڑی کے تختوں کی لمبی قطار، ارد گرد چمن۔ وہ سب اس جگہ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ بڑی تعریفیں کیں۔ انھیں خوش دیکھا تو مست نے کہا:

"یہی تو ہوا صاحب، کہ ہمارے شیخ نے پہلے اس پُر فضا جگہ پر سارا سرمایہ لگا دیا اور مدرسے کی عمارت کے لیے کچھ نہ بچا۔ خیر اچھا ہوا۔ یہ جگہ تو بن گئی۔ وہ بھی آپ دوستوں کی مدد سے بن ہی جائے گی۔"

خیر۔ وہ زمانہ تو گزر گیا۔ ہر زمانہ گزر ہی جاتا ہے۔ اب وہاں عمارتیں بھی ہیں۔

کتابیں بھی ہیں۔ بڑے بڑے استاد بھی ہیں۔ ضابطہ اور قانون بھی ہے۔ ڈھنگ ہے، سلیقہ ہے، کام ہے۔ کوئی بیس برس سے اوپر اس مدرسے کو وہاں ہوگئے ہیں۔ سب اسے جان پہچان گئے ہیں۔ آدمی پہچانے ہوں کہ نا پہچانے ہوں، کہ آدمی کا کچھ ٹھیک نہیں۔ پر جانور، پیڑ، جمنا کی مچھلیاں، جن میں سے بعض ان کے استادوں سے باتیں کرنے پل کے ستونوں پر چڑھتی ہوئی بھی دیکھی گئی ہیں؛ دریا کے کچھوے، پاس کے کھیتوں کے تیتر، خرگوش، سب انھیں جان گئے ہیں اور ان کے دوست بن گئے ہیں۔ اس وقت آپ کو سنانا انھیں دوستوں کا ایک قصّہ ہے۔

برسات کے موسم میں اوکھلے میں جمنا کے کنارے جہاں تک نظر جاتی ہے پانی ہی پانی پر پھسلتی چلی جاتی ہے۔ مگر جب پانی اتر جاتا ہے تو پُل پار کر کے چلے جائیے تو لکڑی کے تختوں کے نیچے نیچے ریت کا ایک میدان ہوتا ہے اور پُل کے اس سرے سے نیچے کو اتر لیجیے تو دریا کے کنارے کنارے دور تک جا سکتے ہیں۔ یہاں اس مدرسے کے استاد کوئی کبھی کبھی، کوئی روز، صبح صبح ٹہلنے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی مدرسے کے بچّے بھی ادھر سیر کو نکل جاتے ہیں۔ یہیں دریا میں ایک کچھوا، بہت بڑا سا کچھوا، اپنے خول میں بند، جیسے ایک مضبوط قلعے میں ہو، رہتا ہے۔ اور جب دیکھتا ہے کہ میدان خالی ہے تو یہ بھی پانی سے

نکل کر ہلکے ہلکے چہل قدمی تو کیا، کہ چالیس قدم تو بہت ہوتے ہیں، آٹھ دس قدم چل لیتا ہے۔ ایک دن مولوی غفران ادھر ٹہلنے گئے۔ انھیں کچھوا کئی بار دیکھ چکا تھا۔ مولوی صاحب یوں بھی کم آمیز آدمی تھے۔ اس لیے کچھ پوری جان پہچان کی نوبت نہیں آئی تھی۔ کچھوا انھیں دیکھتا تو آدھا پانی میں اور آدھا کنارے پر ہوتا اور مولوی صاحب اس خیال سے کہ جتنا تیز چلوں گا اتنا ہی وزن گھٹے گا تیز تیز اس کے پاس سے نکل جاتے تھے۔ اور چلتے بھی اس شان سے تھے کہ "نظر بر قدم" نہ اِدھر دیکھنا نہ اُدھر کہ کہیں قدرت کے دل بہلاؤ فریب ان کی خودی کو کمزور نہ کر دیں۔ وزن کا گھٹانا اور خودی کا مضبوط رہنا بہر حال مقدم ہیں۔ وہ کچھوا ان کا چہرہ دیکھتا، کالی کالی ڈاڑھی کی چمک دیکھتا، اور سوچتا کہ بڑا نورانی چہرہ ہے۔ دھیان گیان والا اَنش دکھائی پڑتا ہے۔ اسے خیال ہوا کہ وہ جو ایک بات اتنے دن سے ستا رہی ہے وہ ان سے پوچھوں۔ اس خیال سے ایک دن کنارے کے پاس باہر کو نکل آیا کہ مولوی صاحب پاس سے گزریں گے تو پوچھوں گا۔ مولوی غفران ٹھیک وقت پر گزرے۔ مگر کچھوے کی ہمّت نہ پڑی۔ کچھ نہ بولا۔ اور یہ اسے دیکھے بغیر آگے بڑھ گئے۔ دن بھر کچھوا اُداس اُداس رہا۔ کہ ہم بھی کیسے پھسڈّی ہیں کہ ملّاجی سے ایک بات پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دوسرے دن تہجّد ہی کے وقت سے کنارے پر آن بیٹھا کہ کہیں سویرے ہی مُلّاجی نہ نکل جائیں۔ مولوی غفران تو کنجی دی ہوئی گھڑی کی طرح

وقت کے پابند تھے ۔ اپنے ٹھیک وقت پر وہاں سے گزرے ۔ مگر وہی بے سُدھ سرپٹ۔ کچھوا
اپنے پوپلے منہ سے ایک بول بھی نہ نکال پایا کہ یہ گزوں آگے بڑھ گئے ۔ مگر ہمّت کر کے
کچھوے نے اپنی میٹھی میٹھی بھرّائی ہوئی آواز میں چلّا کر پکارا "مُلّا جی، مُلّا جی"۔ مولوی غفران
چلتے چلتے مراقبہ کرتے تھے ۔ آواز جو آئی تو سمجھے غیب سے کوئی ندا ہے۔ جی دھک سے
ہو گیا۔ عادت کے خلاف اِدھر اُدھر دیکھا ، سامنے پیچھے ، دائیں بائیں ۔ مگر کوئی دکھائی نہ
دیا۔ سمجھے کوئی شیطانی وسوسہ ہو گا۔ پھر آگے بڑھے تو کچھوے نے زور سے پُکارا ، اور
چلّانے میں آواز اور بھی پھٹ گئی تھی "ہے مُلّا جی شَما کرو ، ذرا تھمو۔ ایک پرشن پوچھنا ہے"۔
مُلّا جی ٹھٹکے ، مُڑ کے پیچھے دیکھا تو ایک بڑا سا کچھوا ، ایک سخت خول سے ڈھکا ہوا ، جیسے
فولاد اور سینگ ملا کر جنگی ٹینکوں کا کوئی چھوٹا نمونہ بنایا ہو ، آہستہ آہستہ پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔
ایسا لگتا تھا کہ غریب کا سانس پھُول گیا ہے۔ چہرے کے نیچے گردن بار بار ہوا سے پھول
جاتی ، پھر دب جاتی ۔ مولوی غفران مڑ کر کچھوے کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو گئے ۔ فاصلہ
کئی گز کا ہو گیا تھا۔ کچھوا جو خشکی پر آ کر ہمیشہ "آہستہ خرام بلکہ مخرام" کا وظیفہ سنسکرت شبدوں
میں جپا کرتا تھا بڑی ہمّت کر کے اس لمبی مسافت کو طے کرنے کا نشچے کر چکا تھا۔ اِدھر مولوی
غفران کو وقت کا خیال ، بولے "کیا بات ہے ، کہو نا ، بولتے کیوں نہیں"، کچھوا رُک گیا۔
جیسے رُکنے کا بہانہ ہی ڈھونڈ رہا ہو ، پھر بولا "نمستے ، مُلّا جی ، نمستے ۔ ایک پرشن پوچھنا ہے
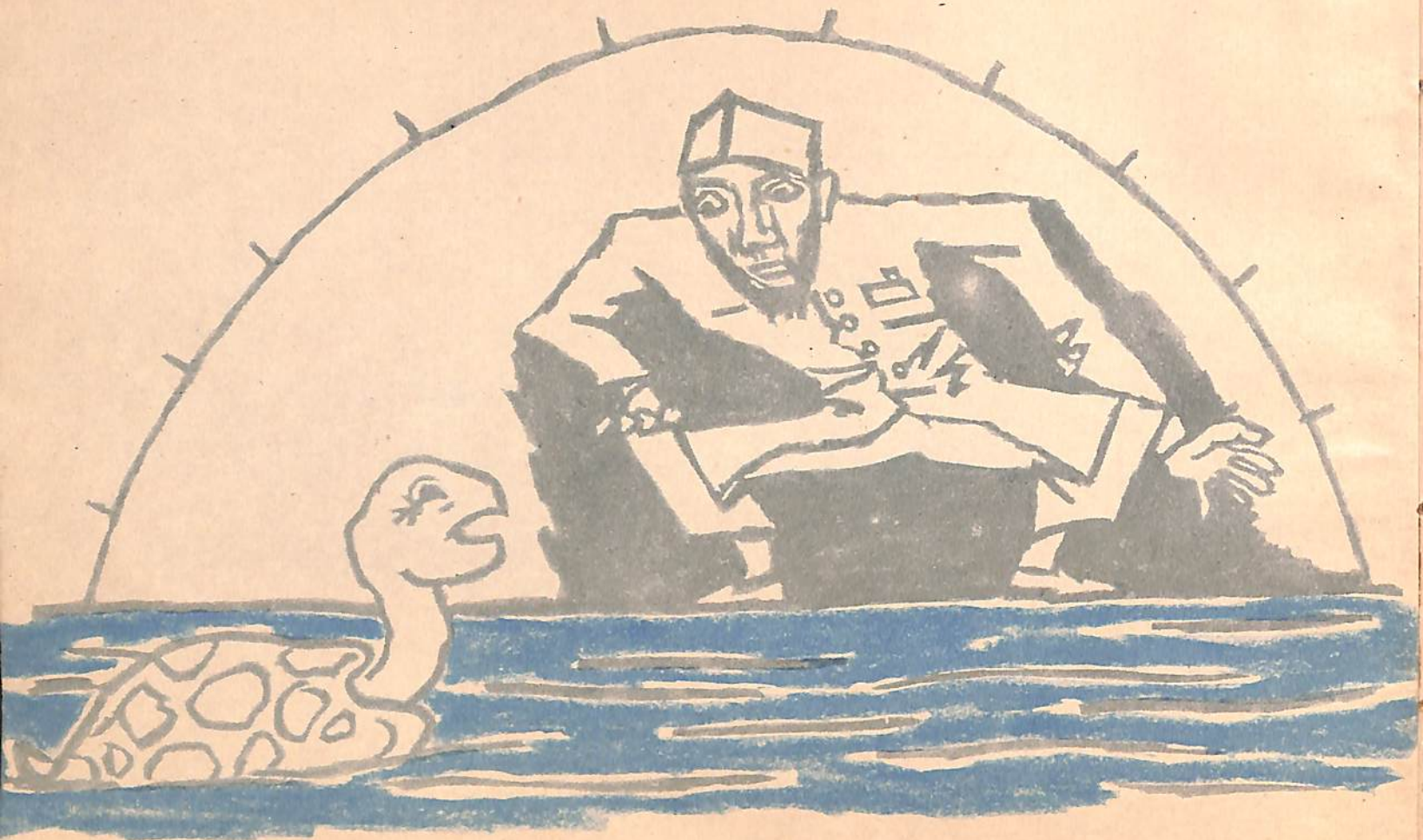
آپ سے ۔کرپیا ذرا ٹھمو ۔ابھی پالاگن کو آتا ہوں۔" مولانا بولے "تسلیم تسلیم ۔بھئی ہمیں تو دیر
ہو رہی ہے ۔ جو پوچھنا ہو پوچھیے ۔مگر یہ پرشن کیا ہوتا ہے۔" کچھوا بولا "مُلّاجی ۔جو پوچھتے ہیں
اس کو پرشن کہتے ہیں ۔اپنی اپنی بھاشا ہے ، مُلّاجی۔" "اچھا تو پوچھیے نا" مولانا نے کہا۔
"مُلّاجی ، تُرت جو جھپٹا ہوں آپ کے پیچھے تو ہانپ گیا ہوں ۔آتے آتے ہی آپ تک آپاؤں گا۔آپ
ہی دو ڈگ بھر کر نیک ادھر کو آجاتے تو بڑی کرپا ہوتی ۔پرشن میرے لیے اَدِھک مَہتو کا ہے ۔
سوریہ نمسکار کے بعد سے آپ کی پرتیکھپا میں ہوں۔" "یہ پرکیھپا کیا چیز ہوتی ہے؟" مُلّاجی میں نے
کہا پرتیکھپا میں ہوں ۔اتھوا آپ کے مارگ پر آنکھیں جمائے بیٹھا ہوں۔" "میری مرگ پر ۔میرے
مرنے پر آنکھیں جمائے بیٹھے ہو ۔بہت اچھی رہی ۔واہ بھائی واہ ۔ پنڈت کچھو رام ، بہت
اچھی رہی ۔میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے ، پنڈت جی ، جو آپ کو میری موت کا اتنا انتظار ہے۔"
کچھوا بولا "ٹھیک ٹھیک ۔یہی جو آپ نے کہا انتجار میں سمجھتا ہوں پرتیکھپا یہی ہے ۔شبدوں
کا پھیر ہے ۔مُلّاجی بات ایک ہے۔" "اچھا پرتیکھپا انتظار ہے تو آپ کو میری مرگ کا ۔میرے
مرنے کا ایسا انتظار کیوں ہے ۔میں نے آپ کا کیا بگاڑا ہے پنڈت جی ۔" "مُلّاجی" کچھوا بولا۔
"سب شبدوں کا پھیر ہے ۔آپ گرم نہ ہوں مُلّاجی ۔میں نے مارگ جو کہا تو مارگ اتھوا پتھ"
اور "پتھ اتھوا ۔" مُلّاجی نے پوچھا "پتھ اتھوا" "پتھ اتھوا ۔ہاں ، پتھ اتھوا رستہ" مُلّاجی کچھ شرمندہ
ہوئے کچھ مطمئن اور بولے "اچھا سمجھا ۔تو مطلب آپ کا یہ فرمانا تھا کہ آپ میری راہ تک رہے

تھے۔ میرا انتظار کر رہے تھے۔ خیر کہیے۔ پوچھنا کیا ہے آپ کو۔ بس سوال کیجیے تو جواب دوں
اور آگے چلوں۔" کچھوے نے کہا۔ "مُلّاجی، سوال اتھوا اور جواب اتھوا۔" مُلّاجی بولے "بھئی
یہ تو بڑی دیر ہو رہی ہے۔ جانتا تو لغت ساتھ لیتا آتا۔" "اور لُگت اتھوا" کچھوے نے کہا۔
"بھائی دیکھو سوال تو وہ جو پوچھتے ہیں جس کو تم نے پرشن کہا تھا۔ جواب وہ جو وہ بتاتا ہے
جس سے پوچھتے ہیں۔ اور لغت وہ جس میں لفظوں کا، بولوں کا، مطلب لکھا ہوتا ہے۔" "سمجھا'
سمجھا" کچھوے نے کہا۔ "سوال اتھوا پرشن۔ جواب اتھوا اُتّر۔ مطبل سو یہ شبد ہم نے اپنے پُرکھوں
سے سن رکھا ہے۔ جب جمنا ندی ادھر نیلوی کھیری کے پاس بہتی تھی اور بڑے بڑے مسلمان سنت
وہاں سوریہ نکلنے سے پہلے آکر منہ ہاتھ دھوتے کُلّا کرتے تھے، ان کی باتیں ہمارے پُرکھے سُنا
کرتے تھے۔ اس میں سے کچھ شبد یاد رہ گئے تھے۔ سو 'مطبل' تو ہم جانتے ہیں۔ 'مطبل' اتھوا ارتھ۔
ہاں اور لُگت اتھوا شبد کوش جس میں شبدوں کا ارتھ لکھا ہوتا ہے۔ سمجھے، ہم سمجھ گئے۔"

"اچھا ہوا آپ سمجھ گئے۔ مگر پھر کل لغت یا آپ کا شبد کُش لاؤں گا تو آپ سے باتیں ہوں گی"
مُلّاجی نے کہا۔

"نہیں نہیں" کچھوا بولا "ایسی بھی کیا بات ہے۔ دیکھیے تھوڑے سے سمے میں ہم نے ایک
دوسرے کے کتنے شبد جان لیے۔ بات چیت چلے گی تو میں آپ کا مطبل سمجھ لوں گا۔ میرے
شبدوں کا ارتھ آپ سمجھ لیں گے۔"

"اچھا تو کچھو رام جی ۔ کہیے تو کہ سوال نہیں آپ کا پرشن کیا ہے۔"

"پرشن یہ ہے مُلّا جی ۔ کہ آپ کی اِتہاس کی پستکوں میں کیا لکھا ہے؟ کہیں یہ لکھا ہے کہ پراچین کال میں کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہوئی تھی ۔ اور بھلا کیا لکھا ہے کہ کون جیتا تھا۔"

مولوی غفران کو ہوتے ہوتے کچھو رام کی بھولی بھولی باتیں کچھ اچھی لگنے لگی تھیں۔ پھر کچھ لفظ بھی نئے سیکھے تھے ۔ پنڈت جی کے پوپلے پوپلے منہ سے باتیں اور بھلی لگتی تھیں۔ مگر کیا کرتے ۔ سوال ایسا تھا کہ جس کا تعلق تاریخ قدیم سے تھا اور ان کا میدان تھا دینیات اور الٰہیات ۔ اس میں کتے بلی، خرگوش اور کچھوے کا کیا کام ۔ پھر آدمی دیانت دار بھی تھے ۔ فرمایا "پنڈت جی، سچ بات یہ ہے کہ مجھے معلوم نہیں ۔ یہ بات تو تاریخ کا کوئی ماہر ہو تو بتائے۔ ایسا ہی ہو گا تو کل اپنے ساتھ مدرسے کے تاریخ کے ماہر کو لیتا آؤں گا۔ ان سے آپ جو پوچھنا چاہیں پوچھ لیجیے گا ۔ اب مجھے اجازت دیجیے ۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔"

"اچھا اچھا ۔ مُلّا جی شما کریں ۔ میں کل انتجار کروں گا ۔ ٹھیک ہے نا ۔ یہ شبد انتجار۔"

"ہاں ٹھیک ہے ۔ جو سمجھ میں آجائے وہی ٹھیک ہے ۔ میں کل ضرور آؤں گا۔"

کچھو رام تھوڑی دیر تو کچھ دھیان میں وہیں کھڑے رہے ۔ پھر ہلکے ہلکے پانی کی طرف بڑھے اور اس میں پہنچتے ہی یہ جا وہ جا ۔ ایسا لگا جیسے سب باتیں بھول گئے ہوں اور جی میں جی آگیا ہو ۔

دوسرے دن صبح ہی گجردم کچھورام کنارے پر آن بیٹھے۔ مولوی غفران ٹھیک اپنے
معیّن وقت پر آئے۔ ان کے ساتھ آج پروفیسر کپچاق بھی تھے۔ دُبلے پتلے۔ ہاتھ میں ایک
کُبڑی لکڑی۔ اسے برابر گھماتے جاتے یا چلتے چلتے جوتے کی نوک سے اس پر ٹھوکر لگاتے جاتے۔
تھوڑے تھوڑے وقفے سے گردن کو ایک خاص انداز سے خفیف سا جھٹکا بھی دیتے رہتے،
جیسے اپنے آپ سے دل ہی دل میں بحث کر رہے ہوں اور جہاں کہیں کوئی زوردار لفظ اس
اندرونی مکالمے میں آجاتا ہو وہیں گردن کو خود بخود جنبش ہو جاتی ہو۔ کھڑے ہوتے تو چھڑی کے
مونٹھ پر ان کی انگلیاں ایسے چلتیں جیسے ہارمونیم بجا رہے ہوں۔ غرض بڑے مزے کے آدمی تھے۔ آج
مولوی غفران کی آنکھیں خلاف معمول پہلے سے پنڈت کچھورام کی متلاشی تھیں۔ وہ بھی
پرتیکھا میں چشم براہ تھے۔ دیکھتے ہی مولانا کے منہ سے نکلا "اَلسَّلام علیکم" اور پروفیسر کپچاق نے
کہا "تسلیم پنڈت جی" پنڈت کچھورام بولے "نمستے۔ کلیان ہو۔ کلیان۔ آپ آگئے۔ جی ادھک
پرسنّ ہوا۔"

"اوہو" مولانا غفران بولے "لغت وہی آپ کا شبدکُش تو لانا بھول ہی گیا۔ خیر یہ تو دعا سلام
تھا۔ سمجھیے کہ سمجھ ہی لیا۔ اب آپ اپنا سوال ہاں وہی اپنا پرشن کیجیے۔ یہ پروفیسر کپچاق تاریخ
کے بڑے ماہر ہیں۔ یہ آپ کا جواب یعنی اُتّر دیں گے۔"

"پرفیسر کشیپ جی۔ ایک بات ہمیں بہت دن سے ستا رہی ہے۔ کل مُلّاجی سے پوچھی تھی

پروفیسر
مولوی غفران
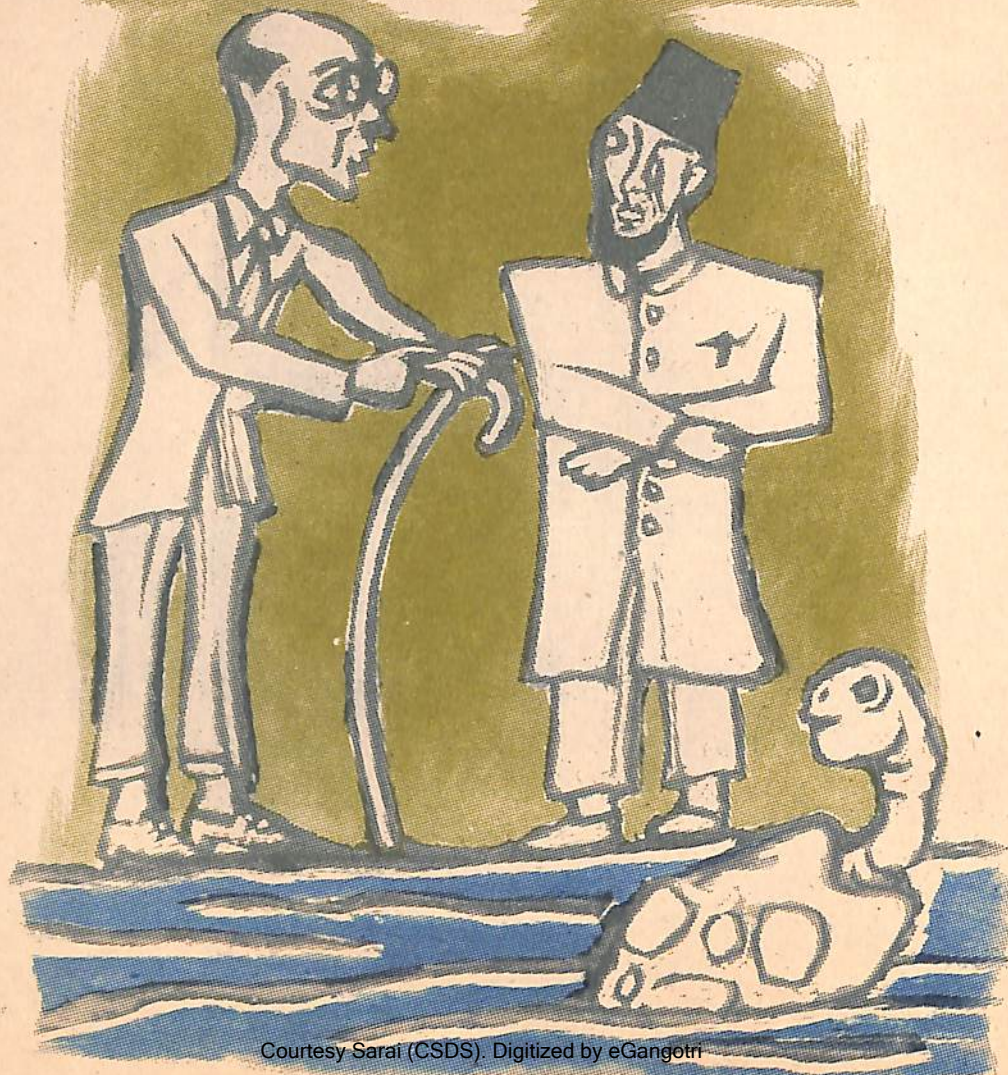
تو انھوں نے کہا ہم نہیں جانتے ۔ پرفسر جی کو ساتھ لائیں گے ۔ سو اب آپ سے وہی بات پوچھنی ہے ۔ بات یہ ہے کہ پراچین کال میں کیا کبھی خرگوش جاتی اور کچھوا جاتی کے لوگوں میں کوئی دوڑ ہوئی تھی ۔ اور ہوئی تھی تو جیت کس کی ہوئی تھی اور ہارا کون تھا ۔ ہمارے یہاں پُرکھوں سے یہ بات چلی آتی ہے کہ دوڑ ہوئی تھی اور کچھوا جیتا تھا ۔"

پروفیسر کیچاق کو ایسا لگا کہ پنڈت جی نے انھیں کوئی بچّوں کی کہانیاں لکھنے والا ٹٹ پونجیا سمجھ لیا ہے اور صبح کی ہوا کے سرور میں ان کی طبیعت کچھ پھر پھرا رہی ہے اور یہ مجھ سے مذاق کرنے چلے ہیں ۔ سخت ناخوش ہوئے ۔ انھیں ویسے بھی ناخوش ہونے میں کچھ زیادہ جتن نہیں کرنے پڑتے تھے ۔ بولے "حضت ، کچھوے اور خرگوش سے میرے فن کو کیا علاقہ ۔ میں تو تاریخ کا استاد ہوں ۔ اقوام وملل کے عروج وزوال کے عملِ مسلسل پر تفکّر و تفقّہ میرا کام ہے ۔ قوائے دولت آفریں کی مخصوص اشکال کے تقاضوں کا تفحص اور ہئیت اجتماعیۂ انسانیہ پر ان کے اثرات کی توضیح ، معاشرے میں طبقاتِ معاشی کے تصادم کے ناگزیر عواقب ونتائج کی تشریح ، محرکاتِ انقلابی کے ظہور وبلوغ کے اسرار و غوامض کو تحقیق وعقیدت کے آمیزے سے قابلِ فہم بنانا ، استعمار اور استحصال کے داخلی تضادوں کی روشن بصیرت اور ان عفریتوں کے مفتوح ومعدوم ہونے پر انسانیت کی حقیقی تاریخ کا ایک عقلی ومعروضی نقشہ مُرتب کرنا ۔ یوں کہ ماضی سے مستقبل منطقی لزوم کے ساتھ مستخرج ہو ۔ یہ میرا کام ہے ۔ یہ کچھوے اور خرگوش سے متعلق استفسار آپ نے

مجھ سے خوب فرمایا۔"

کچھوے بیچارے کا سانس اوپر کا اوپر نیچے کا نیچے رہ گیا۔ گھبرا کر جو اندر کو دم کھینچا تو جھرّیوں والے چہرے کے نیچے گردن میں گھیگے کی طرح کچھ پھول سا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ بیٹھ گیا تو ایسا لگا کہ ان کی جان میں جان آئی۔ پروفیسر صاحب سے کچھ کہنے کی ہمّت کہاں تھی، کچھ سہمے سہمے ڈرتے ڈرتے مُلاّجی سے بولے "مُلاّجی، کیا بات ہوئی۔ کیا پرفیشر جی ہم سے کچھ روٹھ گئے۔ یہ اتنی ڈھیر سی گالیاں ہمیں کیوں دے ڈالیں۔ ہم نے انجان ہونے کے کارن ایک بات پوچھی تھی۔ وہ تو برس ہی پڑے۔ سمجھے تو ہم کچھ نہیں اور آپ شبد کوش بھی لے آتے تو کہاں تک مجھے سب شبدوں کا ارتھ بتاتے اور گالیوں کا ارتھ شبد کوش میں بھی کہاں تک ملتا۔ پر یہ تو بتایئے کہ یہ ایسے روٹھ کیوں گئے۔ میں ان سے شما مانگتا ہوں، اب کچھ نہیں پوچھوں گا۔ بس چپ ہی بھلی۔"

مولوی غفران جنھیں لڑکے آپس میں غفر غٹ کہا کرتے تھے اس نام میں سامی اور آریائی زبانوں کی دو ثقیل آوازوں کی یکجائی سے گمان ہوتا تھا کہ سخت قسم کے آدمی ہیں مگر سچ یہ ہے کہ بڑے نرم مزاج بھلے مانس تھے۔ انھیں کچھوا رام غریب پر ویسے ہی ترس آرہا تھا۔ اور پروفیسر صاحب کے ذہنِ مبارک سے لفظوں کا جو آبشار رواں تھا اس پر یہ خود تعجب اور حیرت میں تھے۔ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ پروفیسر سے رات کوئی رجعت پسند نوجوان الجھ گیا تھا۔

جس سے ان کی طبیعت بہت بدمزہ ہوگئی تھی۔ خون کا دباؤ ویسے ہی کچھ زیادہ رہتا تھا شاید کچھ
اور بڑھ گیا تھا، پھر رات بھر سوئے نہیں تھے۔ سویرا ہوتے آنکھ لگی تھی کہ مُلّاجی فجر کی نماز اوّل
وقت پڑھ کر ان کے کمرے پر پہنچ گئے اور اٹھا دیا۔ رات بھر جاگنے کے بعد صبح سوتے ہوئے
پکڑا جائے تو آدمی بہت کھسیانا ہوتا ہے۔ مُلّاجی نے کواڑ کھٹکھٹائے تو پروفیسر ہڑبڑا کر اُٹھ
بیٹھے اور اس ڈر سے کہ مُلّاجی یہ نہ کہیں کہ صبح کی نماز نہیں پڑھی بولے "ابھی نماز پڑھ کر لیٹ
گیا تھا کہ آنکھ لگ گئی"۔ مُلّاجی نے کہا "آج ذرا ٹہلنے ساتھ چلیے۔ آپ کو ایک بوڑھے پنڈت
سے ملائیں، وہ آپ سے ملنے کے بہت مشتاق ہیں"۔ پروفیسر رات والے نوجوان سے ایسے
ناخوش ہوئے تھے کہ بوڑھے پنڈت سے ملنے کی طرف طبیعت راغب ہوگئی۔ ورنہ معمولاً یہ
بوڑھوں سے بہت تنگ اور ان کی طرف سے خاصے بدگمان رہتے تھے۔ پھر مولانا سے ان کے
مراسم بھی بہت محبّت اور خلوص کے تھے، ساتھ چلے آئے۔ لیکن کچھوے کے اس سوال پر،
کہ ان کے نزدیک اس میں ان کے فنِ محترم کی ہنسی اڑانی مقصود تھی، بپھر پڑے۔ ورنہ یوں
باوجود اعصابی امراض کے یہ بھی بڑے نرم گفتار اور ملنسار آدمی تھے۔

مُلّاجی نے چاہا کہ صفائی ہوجائے۔ کچھو رام سے کہا "پنڈت جی آپ کو بالکل غلط یہ
گمان ہوا کہ پروفیسر صاحب نے آپ کو گالیاں دیں۔ یہ تو اپنے علم کے، جسے آپ وِدیا کہتے
کہتے ہیں، حدود اربعہ بتا رہے تھے"۔

"ہدودا ربا ۔ اتھوا" کچھوے نے بے سوچے پوچھ لیا۔

"حدود اربعہ اتھوا چوحدّی یعنی یہ ودّیا چاروں طرف کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔"

"اتھوا اپنی ودیا کی سیمائیں بتا رہے تھے ۔ سمجھے، ہم سمجھے" کچھوے نے کہا۔

"اور بھائی پروفیسر صاحب"۔ ملّا جی نے کہا "آپ کو بڑی غلط فہمی ہوگئی ۔ پنڈت جی کا مقصد ہرگز آپ کی ہنسی اڑانا نہ تھا۔ یہ بات تو ان کے سان گمان میں بھی نہیں ہوسکتی۔ یہ بیچارے تو کئی دن سے اس بات کا پتہ چلانا چاہ رہے تھے کہ کبھی کچھوے اور خرگوش کی دوڑ ہوئی ہے یا نہیں ۔ اور ہوئی ہے تو کون جیتا اور کون ہارا۔ یہ بات ان کے جی کو لگی ہوئی ہے۔ مجھ سے بھی پوچھ چکے ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ یہ کوئی دینیات کا مسئلہ تو ہے نہیں کہ میں بتا سکوں۔ اس لیے تاریخ کے ایک بڑے ماہر کو اپنے ساتھ لے آؤں گا۔ پچھلے زمانے میں جو کچھ ہوا ہے اس کا کھوج یہی لگاتے ہیں اور یہی اس کا حال جانتے ہیں۔ غلطی ہوئی تو مجھ سے ہوئی ، ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔"

"شما چاہتا ہوں پرفیسر جی ۔شما دے دیجیے۔ میں بھلا آپ کی ہنسی کیسے اڑاتا۔ آپ جیسے ودّوانوں کے درشن کب کب ہوتے ہیں۔ یہ خرگوش اور کچھوے کی دوڑ کا پرشن مجھے نہ جانے کب سے ستا رہا ہے۔ کبھی پانی میں جاتا ہوں۔ کبھی دھرتی پر آتا ہوں۔ نہ وہاں چین ملتا ہے نہ یہاں۔ جی کو ایسی بے کلی ہے کہ نیند نام کو نہیں آتی ۔ ویسے ہی بڑھاپے کے کارن نیند

کم ہوتی ہے۔ پر ادھر تو پیتھوں سے پلک نہیں جھپکی۔ میری باتوں میں کوئی اونچ نیچ ہو گئی ہو تو شما چاہتا ہوں۔"

مُلّا جی اور کچھورام یہ سب کہہ رہے تھے اور پروفیسر کپچاق تھے کہ اپنی چھڑی گھمائے جاتے تھے اور چُپ تھے۔ آخر کو بولے ــ "مولانا۔ بہت نادم ہوں کہ اس کم بخت بے خوابی نے اعصاب کی یہ حالت کر دی ہے۔ میں تو آیا ہی تھا پنڈت جی کی مدد کرنے لیکن ان کا سوال مجھے کچھ ایسا بے تُکا لگا کہ میں سمجھا کہ یہ میری اور، میں تو خیر کیا چیز ہوں، میرے مضمون کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ اپنی ہنسی کا تو میں خیال نہیں کرتا مگر میرا مضمون! نہیں مضمون کی شان میں کسی کی بے ادبی مجھے گوارا نہیں۔ مضمون، کیسا مضمون؟ تقدیرِ کائنات اس سے وابستہ کہ شہنشاہِ کائنات انسان کے ماضی کی تفسیر اور مستقبل کی نشان دہی اس کے سپرد ہے۔ نہیں۔ مضمون کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہیں کی جا سکتی۔ میں سمجھا یہ میرے مضمون کو کتّے بلّی، کچھوے، اور خرگوش کی کہانی، سمجھتے ہیں۔ اس لیے میرا فرض تھا کہ انھیں بتا دوں اور میں نے بتایا۔ ہاں ذرا تفصیل سے اور ذرا شدّت سے کہ میرے مضمون کا موقف یہ نہیں ہے۔ مولانا۔ میرا حال کچھ یہ ہے کہ ناگواری میں کلام میں طوالت اور زور دونوں پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ غریب سمجھے کہ میں گالیاں دے رہا ہوں۔ گالیاں۔ مورّخ اور گالیاں۔ مفسّرِ تقدیرِ انسانی اور گالیاں۔ شاید یہ میری زبان بھی نہیں سمجھتے۔ اس لیے مولانا آپ انھیں

پوری طرح اطمینان دلا دیجیے کہ میں نے کوئی گالی نہیں دی۔ میرا کام یہ نہیں ہے۔ گالیاں دیتے ہوں گے اپنا وجود قایم رکھنے کے لیے اہلِ سیاست، اپنے اخباروں کی بکری کے لیے اہلِ صحافت یا ناخوشی اور بدمزاجی میں ادیب اور شاعر۔ مورّخ کو گالیاں دینے کی فرصت کہاں۔ ہاں تو تسلّی دیدیجیے انھیں کہ میں نے کوئی گالی نہیں دی اور یہ مجھے معاف کردیں کہ میں نے ان کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس کچھوے اور خرگوش کے معاملے میں ممکن ہے کہ ادب کا پروفیسر آپ کے دوست کی مدد کرسکے۔ مجھے معذور جان کر معاف فرما دیجیے اور ہاں۔ واپس نہیں چلیے گا۔ بہت وقت ہوگیا۔"

مُلّاجی نے کہا "یار پروفیسر، بہت بہکنے لگے ہو۔ چلتے چلتے یہ اہلِ سیاست اور صحافیوں کو ادیبوں اور شاعروں کو بھی لپیٹ لیا۔ خیر جھگڑا ختم کریں۔"

پھر مسکرا کر کچھوے سے کہا "یہ شما مانگتے ہیں۔ میرے دوست کی باتوں میں کچھ ایسا زور تھا کہ آپ سمجھے گالیاں دے رہے ہیں۔ گالیاں تو ہوتی ہی ہیں زور دار۔ مگر اور بول بھی تو زور والے، شور والے، ہوتے ہیں، سب گالیاں نہیں ہوتے۔ آپ تو سہم گئے۔ ان کا مطلب الھوا ہی مطلب بُرا نہ تھا۔ اور اب انھوں نے صلاح بہت ٹھیک دی ہے کہ کسی ادب کے ماہر سے آپ کا پرشن پوچھا جائے۔ کل ہو سکا تو انھیں ساتھ لیتا آؤں گا۔

"یہ ادب کیا ہوا، مُلّاجی؟" کچھوے نے پوچھا۔

"کیسے بتاؤں۔ ادب وہ ہوتا ہے جس میں بڑے سُندر شبدوں میں آدمی کے دل کی باتیں

کہی جاتی ہیں۔ شبدوں میں کبھی ایسی مٹھاس گھول دیتے ہیں کہ گُڑ سے زیادہ میٹھے لگتے ہیں۔ کبھی وہ روانی دے دیتے ہیں کہ لگتا ہے دریا امنڈ آیا ہے۔ وہ زور بھر دیتے ہیں کہ شبد دلوں کو ہلا دیں، پہاڑوں کو چیر دیں۔ اس میں کہانیاں لکھتے ہیں جو لوگ پیڑھیوں تک یاد رکھیں۔ اس میں شبدوں کو ایسے جوڑتے ہیں کہ وہ سنتے ہی جی میں اُتر جائیں۔ لوگ انھیں گاتے ہیں۔ گنگناتے ہیں، اور مزا لیتے ہیں۔ اس میں آدمی کو اپنا حال دکھائی دیتا ہے جیسے آئینے میں کوئی اپنی صورت دیکھے۔ ادب ہنساتا ہے، رُلاتا ہے، جی کو گرماتا ہے، ہمّت دلاتا ہے، حوصلہ بڑھاتا ہے، اور ہمارے ہنر اور عیب سب ہم پر کھول دیتا ہے۔ اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے اس میں۔ میں تو دینیات کا استاد ہوں پوری بات نہیں جانتا۔ مگر یہی سب ہوتا ہے ادب۔"

کچھوا بہت غور سے سنتا رہا اور بولا ــ "مُلّاجی تم نے بتایا اس سے تو ہمیں ایسا لگتا ہے ادب ساہتیہ کو کہتے ہوں گے۔"

"ہاں ہاں۔ ٹھیک کہتے ہو پنڈت جی۔ ساہتیہ ہی کو کہتے ہوں گے ادب۔ اس لیے کہ وہ جو ہماری دلّی میں ساہتیہ اکادمی ہے وہ ادب ہی کا ادارہ تو ہے۔ ٹھیک ہے ادب اتھوا ساہتیہ۔"

"اچھا تو مُلّاجی۔ کل ساہتیہ کے پنڈت کو اَوش لانا۔ ادِھک سمے بیتا جاتا ہے، اور میری بے کلی دن پر دن بڑھ رہی ہے۔ مجھ پر دَیا کرکے کل ہی انھیں ساتھ لے آنا، مُلّاجی۔"

"بہت اچھا پنڈت جی۔ کل ہی ساتھ لاؤں گا انھیں۔ بس اب چلے۔ آداب۔"

"نمستے۔ مُلّا جی اور پرفسر جی۔ روٹھے تو نہیں ہو پرفسر جی۔"

"سب ٹھیک ہے" مُلّا جی نے کہا اور مولوی غفران اور پروفیسر کچھاق دونوں پُل کی طرف چل پڑے۔

"اچھے جھمیلے میں پھنس گئے ہم تو" کچھوے نے کہا "اب دیکھیں ساہتیہ والا کیا کہے۔ کہیں وہ بھی گرم نہ ہونے لگے۔ ایک سیدھی سی بات پوچھتے ہیں اور کوئی پتہ نہیں دیتا، نہ جانے کیسی ودّیا ہے ان ودّوانوں کی۔ اب دیکھیں کل کیا ہوتا ہے۔"

۲۲

مولوی غفران کی دلچسپی کچھوے کے سوال میں بڑھتی جاتی تھی۔ مدرسے میں واپس آئے تو پہلے نہ نہائے دھوئے نہ ناشتہ کیا سیدھے ڈاکٹر فی الفور کے کمرے پر پہنچے۔ ڈاکٹر فی الفور کو بہت تعجب ہوا کہ آج صبح صبح مولانا کیسے بھول پڑے۔ وہ صبح حقّہ پیا کرتے تھے اور اس میں ذرا اونگ بھی جاتے تھے۔ نہانے سے کچھ زیادہ رغبت نہ تھی۔ ہاضمہ کمزور تھا۔ اس لیے ناشتہ بھی رغبت سے نہ کرتے تھے۔ ابھی تو یہ حقّے ہی کی منزل میں تھے۔ مولانا غفران نے "السّلام علیکم" کی "ع" کو حرف حلقی کے صحیح مخرج سے جو نکالا تو یہ چونک پڑے۔ بولے "مولانا آج کیسے اپنے قدموں کی برکت سے اس ناچیز کو نوازا۔ آئیے آئیے۔ تشریف رکھیے۔ اور مولانا ناشتہ بھی آج

یہیں ہوجائے۔" مولانا نے فرمایا "بہت شکریہ۔ مگر میں نے ابھی غسل بھی نہیں کیا ہے۔" ڈاکٹر فی الفور
بولے "مولانا یہ غسل کی آپ نے خوب کہی۔ کیا آپ پر ہر روز غسل واجب ہوجاتا ہے۔" مولانا
کی کتری ہوئی مونچھوں اور ڈاڑھی کے بیچ میں مسکراہٹ کی ایک بہت باریک سی لکیر دکھائی
دی۔ بولے "ڈاکٹر صاحب عادت سی ہوگئی ہے۔ واجب کا معاملہ نہیں ہے۔" "پھر تو ناشتہ
یہیں ہو۔" فی الفور نے کہا۔ "ساتھ میں میں بھی کچھ کھالوں گا۔" مولانا نے کہا "کیوں۔ خیریت۔ کیا
اکیلے آپ کچھ نہیں کھاتے؟ کیوں کیا بات ہے؟" "بات کیا ہوتی" ڈاکٹر فی الفور نے کہا۔ "وہی قبض،
وہی اُم الامراض، قبض۔ ہفتہ ہفتہ بھر گزر جاتا ہے۔ بس ہفتے میں ایک بار نہاتا ہوں اور ہفتہ
میں ایک ہی بار کچھ بسط نصیب ہوتا ہے۔" "عجائب، عجائب" مولانا نے فرمایا "عجائب۔ مگر بھئی
یہ ناشتے اور قبض کا قصّہ تو کسی اور دن طے کریں گے۔ آج تو آپ کو ایک تکلیف دینے آیا ہوں۔"
"خیر تو ہے۔ فرمایئے" ڈاکٹر فی الفور نے کہا۔ مولانا بولے "کچھ ایسی بات نہیں۔ میں صبح صبح ٹہلنے
دریا پر جاتا ہوں۔ وہاں ایک کچھوے سے ملاقات ہوئی۔" "کچھوے سے! آپ نے کیا فرمایا۔
کچھوے سے؟" مولانا نے کہا "جی ہاں۔ کچھوے سے۔" ڈاکٹر فی الفور نے حقّے کی نَے رکھ دی،
اور کہا "کچھوے سے اور آپ کی ملاقات۔ خوب کہی مولانا خوب کہی۔ اور ملاقات کے لفظ
پر تلاش کی داد دیتا ہوں۔"

"نہیں بھائی۔ ڈاکٹر۔ اس میں خوب کہنے کی کیا بات ہے۔ جی ملاقات ہوئی۔ باتیں

ہوئیں۔ بیچارہ بڑا نیک دل بھولا سا بوڑھا ہے۔ سخت الجھن میں ہے۔ مجھ سے ایک بات پوچھی۔
وہ دینیات سے متعلق نہ تھی اس لیے میں تو جواب دے نہ سکا۔ دوسرے دن پروفیسر کیچاق
کو لے گیا کہ سوال ماضی کے ایک واقعے سے متعلق تھا اور میں سمجھا کہ ماضی کے راز دان امین
مورّخ ہی ہوتے ہیں۔ وہ جو گئے اور اس غریب کچھوے نے ان سے وہی سوال کیا تو یہ ایسے بگڑے،
ایسے بگڑے، کہ میرے قلب میں تو "یا حفیظ" کا ذکر رواں ہوگیا۔ پروفیسر سمجھے کہ اس بوڑھے نے ان کی
جان کر توہین کی ہے۔ ان کی اور اُن سے زیادہ ان کے مضمون کی تحقیر کی ہے۔ اور وہ تقریر
جھاڑی ہے کہ کچھوا تو کچھوا میرے چھکّے چھوٹ گئے۔ تاریخ کے جو حدود اربعہ بتائے ہیں تو ایسے
لگا کہ علمِ الٰہی سے بس گز دو گز ہی کم ہیں۔ بہرحال اس غریب کا سوال جہاں کا تہاں رہا۔"

"تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ مولانا۔"

"پروفیسر کیچاق جب ذرا ٹھنڈے ہوئے تو انھوں نے یہ بتایا کہ سوال قصّے کہانیوں کا
ہے، یعنی ادب سے متعلق ہے۔ کسی ماہرِ ادبیات سے پوچھیے۔ اس لیے دریا سے سیدھا آپ کے
پاس آیا ہوں کہ کل میرے ساتھ تھوڑی دیر کو چلے چلیے۔ اس بڈھے کچھوے کی تسکین ہو جائے گی۔"

"تو مولانا سوال آخر کیا تھا۔"

"سوال اس کا یہ ہے کہ اگلے وقتوں میں کبھی خرگوش اور کچھوے میں دوڑ ہوئی تھی کہ
نہیں۔ اور ہوئی تھی تو جیت کس کی ہوئی تھی۔ اس کا معتبر جواب چاہتا ہے۔"

"اوہو۔ وہی ایسپ والا قصہ۔ چلوں گا۔ آپ کے ارشاد پر ضرور چلوں گا۔ اچھا ہوا کہ آپ سے سوال پوچھ لیا۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے حافظہ کمزور ہوگیا ہے۔ اور شاید اس کمبخت قبض کا بھی کچھ دخل اس میں ہو۔ وقت پر اپنے تاریخِ ادب کے نوٹ دیکھ لوں گا اور سائل کو مفصّل معلومات بہم پہنچا دوں گا۔"

"بہت اچھا۔ تو میں اب چلا۔ کل صبح آپ کو لینے آؤں گا۔"

"اور وہ ناشتہ، مولانا۔ ناشتہ تو کیے جاتے۔"

"نہیں ڈاکٹر۔ اب ہمیں جانے دو۔ بے غسل کے کھانا جی کو نہیں لگتا۔"

"آپ کی خوشی۔ مگر میں بھی کھانے کے لیے یہی شرط لگالوں تو شاید ہفتہ ہفتہ بھر کھانا نصیب نہ ہو۔"

"اچھا۔ خدا حافظ۔ کل ملیں گے۔"

صبح کی نماز پڑھ کر مولانا غفران جلدی جلدی ڈاکٹر فی الفور کے یہاں پہنچے۔ ڈاکٹر ابھی سو ہی رہے تھے۔ مولانا نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ پھر کچھ شور سا کیا تو یہ آنکھیں ملتے، مولانا کی نماز باجماعت کے خیال سے کچھ خجل، معذرت کرتے، جس میں اس موذی قبض کے نیند میں مخل ہونے کی دلیل بھی شامل تھی، اٹھے۔ منہ پر پانی کا چھپکا مارا اور اپنا پرانا ربر سول جوتا پہنا جس کے ایک تلے میں چھوٹا سا سوراخ ہوگیا تھا اور جو اس زمانے کی یادگار تھا جب یہ بھی صبح ٹہلنے جایا کرتے

تھے ۔ یہ جوتا انھوں نے شام ہی سے اس مہم کے لیے تیار کر رکھا تھا ۔ ہاں تو یہ جوتا پہنا اور مولانا کے ساتھ ہو لیے ۔

دریا پر پہنچے تو کچھوا نہ جانے کب سے منتظر بیٹھا تھا ۔ استقبال کے لیے انچ دو انچ آگے بڑھا ۔ دعا سلام ہوا اور مولانا نے اس سے کہا "حسب وعدہ ساہتیہ کے ایک بڑے جانکار کو ساتھ لایا ہوں ۔ ساہتیہ کا سارا حال انھیں معلوم ہے ۔ اب ان سے اپنی بات پوچھ لو ۔"

کچھوے نے کہا "پنڈت جی مہودے ۔ پرشن ہمارا یہ ہے کہ آپ کی پستکوں میں کہیں لکھا ہے کہ اگلے جگوں میں خرگوش اور کچھوے کی دوڑ ہوئی تھی کہ نہیں ، اور ہوئی تھی تو جیت کس کی ہوئی تھی ۔ سچ مچ کون جیتا تھا ۔ منہ دیکھی مت کہنا ، پنڈت جی مہودے کھری کھری بات ہمیں بتا دو کہ کون جیتا تھا ۔"

ڈاکٹر فی الفور ادب کے پروفیسر تھے ۔ تقابلی لسانیات سے انھیں کچھ بہت لگاؤ نہ تھا ، "پنڈت جی مہودے" اور "پرشن" دونوں پر کھٹکے اور مولانا کی طرف کچھ الزامی نظر سے دیکھا ۔ مولانا تاڑ گئے اور جب کچھوے نے اپنا جملہ ختم کیا تو انھوں نے ڈاکٹر فی الفور سے کہا "انھوں نے "پنڈت جی مہودے" احتراماً کہا ہے ۔ اور آپ تو سیاق و سباق ہی سے سمجھ گئے ہوں گے کہ "پرشن" سے مراد سوال ہے ۔"

"جی ہاں مولانا ۔ سوال دلچسپ ہے اور اس میں تحقیق کے بہت سے پہلو ہیں ۔

ڈاکٹر فی الفور
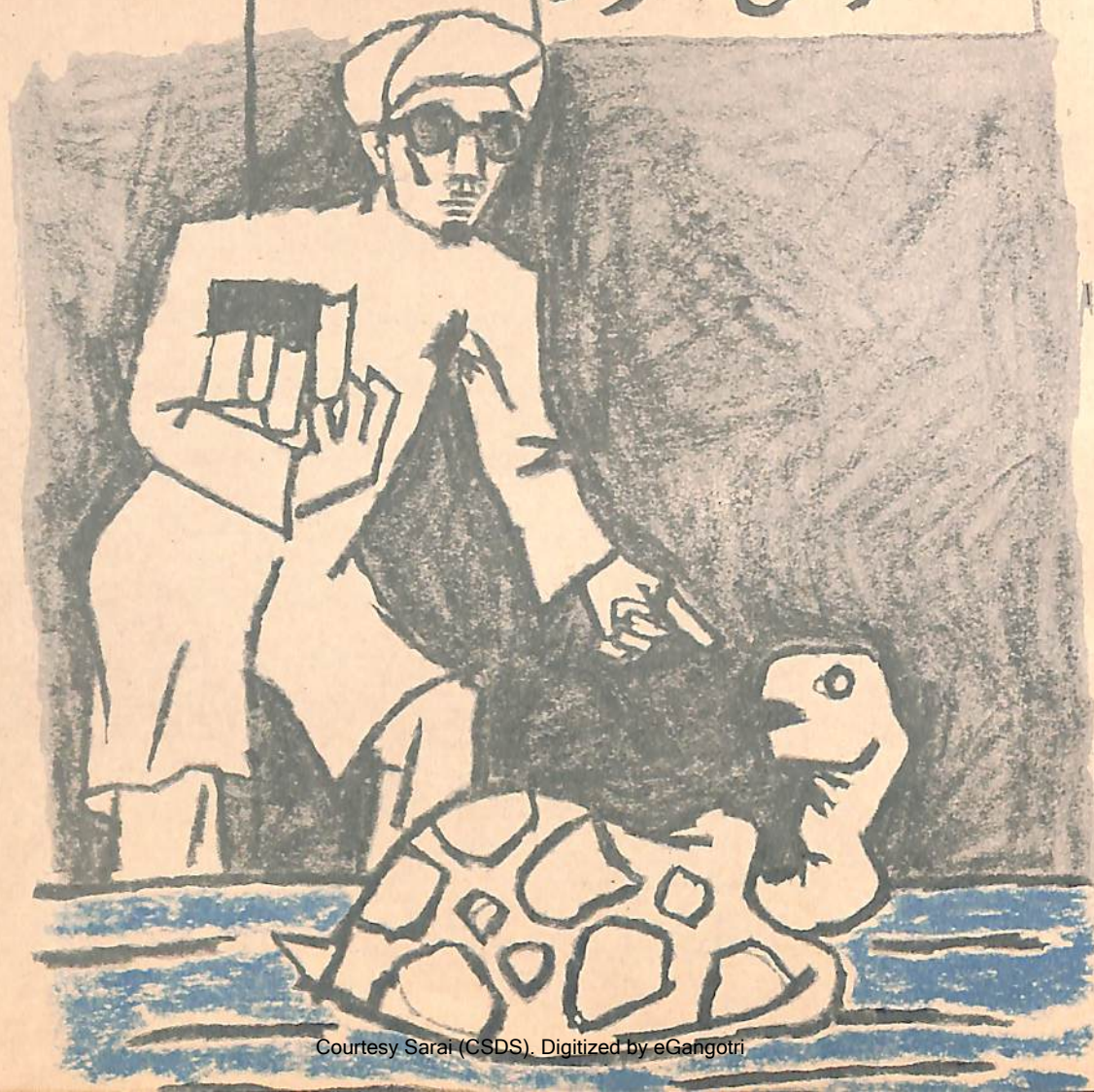
مختصراً بیان کرتا ہوں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ جانوروں کی اور کبھی کبھی جانوروں اور آدمیوں کی ملی جلی کہانیاں پرانے زمانے سے ہندوستان اور یونان کے ساتھ مخصوص رہی ہیں۔ کہیں کہیں دوسرے ملکوں کے ادب میں بھی ایسے قصے ملتے ہیں لیکن زیادہ تر حصہ ان میں انھی دو ملکوں کا ہے، ہندوستان اور یونان کا۔ یہ قصے یونان میں ایسپ کے نام سے منسوب ہیں ـــــ ہندوستان میں زیادہ تر جاتک کہانیوں سے جو بُدھ کے جنم سے متعلق کہانیاں ہیں۔ آج کل ہمارے پاس ایسپ کے قصوں کے نام سے جو مجموعہ ہے وہ یورپ میں چھاپے کا کام شروع ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد سنہ ۱۴۸۰ء میں ہائنرش اشٹائن ہاول نے لاطینی اور جرمن میں چھاپا تھا۔ آٹھ دس سال کے اندر اندر اس کا ترجمہ اطالوی، فرانسیسی، انگریزی، ولندیزی زبانوں میں ہوگیا، مگر اس مجموعے میں جو کہانیاں ہیں وہ فیڈرس نامی ایک یونانی نے پہلی صدی عیسوی میں نظم میں لکھی تھیں۔ ان کے علاوہ بعض کہانیاں یونانی نثر سے بھی لی گئی تھیں جنھیں اصلی ایسپ کی کہانیاں سمجھا جاتا تھا۔ مگر تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ یہ بھی پہلے نظم میں تھیں اور ان کا لکھنے والا تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں ایک شہزادے کا اتالیق تھا۔ اس نظم کرنے والے نے لکھا ہے کہ اس نے بعض قصے ایسپ سے لیے ہیں اور بعض دوسری جگہ سے۔ یہ دوسرے قصے ایک سنگھالی سفارت کے ذریعہ سنہ ۵۲ء میں یورپ پہنچے تھے۔ فیڈرس کے قصوں میں بھی ہندوستانی عنصر ملتا ہے۔"

کچھوے پر اس تقریر کا نہ جانے کیا اثر ہوا کہ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ مولانا نے

بھی محسوس کیا کہ سوال سے غیر متعلق علم کی یہ فراوانی غریب کچھوے کے کچھ کام نہ آئے
گی ۔ آہستہ سے بولے " ڈاکٹر صاحب کلام کو اتنا طول نہ دیجیے ۔ مختصراً جواب دیدیجیے۔
ان کی تسکین ہو جائے گی "۔

مولانا کی آواز سن کر کچھوے نے آنکھیں کھول دیں ۔ مگر ڈاکٹر فی الفور کو یہ
قطع کلام اچھا نہ لگا ۔ بولے "حضرت مولانا ۔ معاف فرمائیں ۔ میری بات کوئی بیچ سے کاٹتا
ہے تو مجھے شدید کرب ہوتا ہے ۔ آپ سے کہہ چکا ہوں کہ قبض کی وجہ سے حافظہ کمزور ہو گیا
ہے ۔ کثرتِ مطالعہ کی وجہ سے علم کا اتنا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے کہ ایک مال دوسرے مال
میں مل جاتا ہے ۔ اس لیے میں نوٹ رکھتا ہوں ۔ رات ہی اس مسئلے پر اپنے نوٹ
آپ کی خاطر دیکھے ہیں ۔ اب اگر آپ مجھے اپنی بات پوری نہیں کرنے دیں گے تو نہ جانے
کہاں کی بات کہاں پہنچے ۔ اور اس آبِ صافی میں کہ آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں نہ
جانے اور کیا کیا مِل جائے ۔ اور سچ یہ ہے کہ میں تو یہ سب کچھ آپ سے کہہ رہا ہوں ۔ ان
کچھوے صاحب سے مجھے کیا سروکار میں تو ان کے سوال کو آپ کا سوال سمجھتا ہوں ۔ اور
اہلِ علم کو اہلِ علم سے جس شان کے ساتھ بات کرنی چاہیئے اس شان سے بات کر رہا ہوں ۔
مجھے بولنے دیجیے اور براہِ کرم بیچ میں نہ بولیے ۔ ہاں ۔ تو میں کیا کہہ رہا تھا ۔ بات بالکل ذہن
سے اتر گئی ۔ توبہ "۔ مولانا نے کہا " آپ کسی فیڈروس کا ذکر کر رہے تھے کہ اس کے قصوں

میں بھی ہندوستانی اثر ملتا ہے۔"

"ٹھیک ٹھیک۔ ہاں۔ ان ہی قصّوں میں ہندوستانی اثر ملتا ہے۔ ہندوستان میں ویسے جانوروں کے سبق آموز قصّے بیدپائی ادب میں اور اس سے بھی پہلے جاتک کہانیوں میں ملتے ہیں۔ یہ قصّے ہندوستان سے لنکا پہنچے۔ جنابِ مسیح سے کوئی تین سو سال پہلے۔ اور غالباً اس سفر سے پہلے ان پر یہاں کوئی دو سو سال بیت چکے تھے۔ جاتک کہانیوں میں ایک حال کی کہانی ہوتی ہے ایک ماضی کی۔ حال کی کہانی سے شیخ کو کہیے یا گرو کو ماضی کی کہانی یاد آتی ہے اور اسے بیان کرتے ہیں اور آخر میں ایک مصرعے کے اندر اس کا خلاصہ کر دیتے ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کے بیان میں دریا کا سا بہاؤ تھا۔ اُدھر وہ غریب گھچوا چُپ دَم سادھے، آنکھیں میچے۔ اِدھر مولانا سخت اضطراب کے عالم میں۔ باوجود تنبیہہ کے مولانا سے نہ رہا گیا اور بولے "بھئی ڈاکٹر۔ لِلّٰہ بس کرو۔ اس غریب کے سوال کا جواب دینا ہو تو دے دو ورنہ اس غریب پر اور مجھ نیاز مند پر رحم کرو۔ اچھا چلو گھر چلیں، دن چڑھ رہا ہے۔"

ڈاکٹر فی الفور نے جواب سے پہلے گلا صاف کرنے کے لیے ذرا کھکارا تو منہ سے رات والے پان کی چھالیاں نکل پڑیں۔ گلا ٹھیک صاف نہیں ہوا تو بیٹھی ہوئی آواز میں بولے۔

"دیکھیے، مولانا" آپ پھر بیچ میں بولے۔ پوری بات آپ کو اور ان حضرت کو نہ بتاؤں تو جواب کیسے ہوگا۔ میں ادھورے کام کا قائل نہیں ہوں۔ یا چپ رہتا ہوں یا پوری بات کہتا ہوں۔ بہ ادنیٰ تغیرِ لفظی غالبؔ کا شعر میرے حسبِ حال ہے۔

پُر ہوں میں علم سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

(کلامِ موزوں کی تاثیر سے یہاں ڈاکٹر فی الفور کی آواز خود بخود کھُل گئی)

آپ نے چھیڑا ہے تو سنیے۔ پوری بات سنیے......... مگر لاحول ولاقوۃ۔ میں تو پھر بھول گیا کہ کہہ کیا رہا تھا۔ مولانا آپ بات کاٹ کر کیسا ظلم کرتے ہیں۔ بتائیے میں کیا کہہ رہا تھا"۔

مولانا نے کہا "جی تو نہیں چاہتا کہ بتاؤں۔ میرا حافظہ ابھی ٹھیک ہے۔ اس لیے آپ کی ساری تقریر کا بوجھ میرے ذہن پر ہے۔ آپ کے پاس تو سہل نسخہ ہے۔ بھول جاتے ہیں اور پھر تازہ دم ہو کر نیا حملہ شروع کرتے ہیں"۔

"مولانا یہ باتیں رہنے دیجیے۔ بتائیے کہ میں کیا کہہ رہا تھا۔ وقفہ زیادہ ہوگا تو مجھے سلسلہ ملانے میں بڑی دقّت ہوگی۔ بتائیے، جلد بتائیے"۔

مولانا نے کہا "ہاں بھائی بتانا ہی پڑے گا۔ آپ جاتک کہانیوں میں حال کی کہانیوں اور ماضی کی کہانیوں کی آمیزش کا ذکر فرما رہے تھے"۔

"ہاں ۔ہاں ۔ اصل میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ یہ ماضی کی کہانیاں اور ایسپ کی بہت سی کہانیاں بہت ملتی جلتی ہیں ۔ ایسپ کی بعض اور کہانیاں مہابھارت کی بعض کہانیوں سے بھی ملتی ہیں ۔ اور مولانا اس پر لوگوں نے بہت سر مارا ہے کہ یہ کہانیاں یونان سے ہندوستان پہنچیں یا ہندوستان سے یونان ۔ اس کا حل محققین نے تالمد کی کہانیوں، مدراشی ادب کی تیس کہانیوں سے کیا ہے کہ ان سے ملتی جلتی کہانیاں ہندوستانی بھی ہیں یونانی بھی ۔ لیکن یاد رکھنے کا نکتہ یہ ہے کہ جہاں تالمد کی کہانی یونانی کہانی سے مختلف ہے وہاں ہمیشہ ہندوستانی کہانی کے مطابق ہے ۔ یہ بہت ہی بعید از قیاس ہے کہ یونانی کہانیوں کے ترجمے عبرانی میں ہوئے ہوں اور پھر وہ ہندوستان پہنچے ہوں ۔ لازم ہے کہ کہانیاں ہندوستان سے یونان گئی ہیں ۔ سب سے قدیم ہندوستانی مجموعہ چوتھی صدی قبل مسیح بلکہ اس سے بھی پہلے کا ہے یعنی پنچ تنتر ۔ ہتوپدیس اس کی ایک بعد کی شکل ہے جس میں الگ الگ کہانیاں بیان کے ایک رشتے میں پرو دی گئی ہیں ۔ کلیلہ و دمنہ کی شکل میں یہ قصّے قدیم فارسی اور عربی کے توسّط سے لاطینی میں پہنچے اور اس پر کئی قصّہ نویسوں نے اپنی اپنی عمارت بنائی ۔ یورپ میں ان پر کیا کیا گزری ۔ فیڈرس کی لاطینی نظم ۔ بابریس کی پھُسپھُسی یونانی نثر ۔ میری دی فرانس کا وسطی انگریزی سے ۱۰۳ کہانیوں کا ترجمہ اور براخیہ نقدان، انگریز یہودی کی ۱۰۷ کہانیوں کا مجموعہ جس کا نام تھا "مشلے شوالم" یعنی لومڑی کی کہانیاں اور اشٹائن ہاول

لاناتین اور بن فائی اور ماکس مُلر کی تحقیقات کی تفصیل سنانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر آپ تو پہلے ہی سے کسمسارہے ہیں، مولانا۔ ناحق اس موضوع پر رات دیر تک اپنے نوٹ دیکھا کیا۔"

"بہت شکریہ۔ ڈاکٹر صاحب" مولانا نے ذرا بے صبری سے کہا "اس کہانی کو ختم ہی کیجیے۔ اس علم کے دریا میں اس غریب کچھوے کا سوال تو ڈوب کر غائب ہی ہو گیا۔ اب بھی آپ بتا سکیں تو بتائیے کہ واقعی خرگوش اور کچھوے کی دوڑ ہوئی تھی یا نہیں۔ اور ہوئی تھی تو کون جیتا تھا۔ قصّہ تو ہم نے بھی سنا ہے اور اس غریب نے بھی سنا ہے مگر حقیقت کیا تھی۔"

کچھوے نے بھی کہ آنکھیں بند کیے سو سا گیا تھا آنکھیں کھولیں اور متوجّہ ہوا۔ کبھی مولانا کی طرف تکتا کبھی ڈاکٹر فی الفور کی طرف۔

ڈاکٹر فی الفور نے کہا "حقیقت۔ اس ضمن میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں حقیقت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک تو حقیقت خارجی، حقیقت معروضی اور ایک حقیقت ہوتی ہے حقیقت موضوعی، حقیقت تخیّلی۔ ادب میں فرماں روائی ہوتی ہے حقیقت تخیّلی کی۔ خارجی حقیقت، طرح طرح کی، ادیب یا شاعر کے شعور میں داخل ہوتی ہے۔ وہاں وہ تخیّل کے سہارے ایک نئی حقیقت کی تعمیر کرتا ہے۔ اس عمارت میں نہ جانے کون کون سی خارجی حقیقتیں یکجا ہو جاتی ہیں اور ایک اچھوتی نرالی حقیقت وجود میں آتی ہے۔ یہ خارجی حقیقتوں

کو جوڑتا ہے۔ کسی سے زیادہ لیتا ہے کسی سے کم اور ان کی آمیزش سے ایک مرکّب بناتا ہے۔
اس کی نئی عمارت میں کہیں کی اینٹ ہوتی ہے کہیں کا روڑا۔ کہیں سے بہت کہیں سے تھوڑا۔
اس نئی حقیقت کو وہ اپنی قوتِ اظہار کو کام میں لاکر لفظوں کا لباس پہناتا ہے۔"

"ڈاکٹر مار ڈالا۔ مار ڈالا اتم نے۔ یہ کیا معمّہ پیش کر رہے ہو۔ کچھ پلّے نہیں پڑا۔ آخر اس
خرگوش اور کچھوے والے قصّے سے اس سب کا کیا تعلق"۔

"جناب مولانا۔ تاریخِ ادبی پیش کرتا ہوں تو وہ آپ کو نہیں بھاتی۔ ماہیّتِ ادب پر
روشنی ڈالتا ہوں تو آپ کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ چہ کُنم۔ آخر ادب کا فاضل ہوں۔ ادب
کی اعلیٰ تعلیم میرے سپرد ہے۔ اس کی روٹی کھاتا ہوں۔ میں اگر قصّے اور وہ بھی جانوروں کے
قصّے سناتا اور ان کی تفسیر کرتا پھروں تو تُف ہے مجھ پر۔ سچ تو یہ ہے کہ ادب کی اعلیٰ تعلیم
میں تو جانوروں کے قصے کیا ادب کے بڑے بڑے شاہ پاروں کی طرف توجہ کرنا غیر ضروری
ہوگیا ہے۔ ادب کی تاریخی جڑوں تک پہنچنا، شخصی اور جماعتی دونوں کی تہ کو پہنچنا، ہمارا کام
ہے اور اس میں عمریں کٹ جاتی ہیں، عمریں۔ کلام پڑھنے سے پہلے شاعر کے مفصّل حالاتِ
زندگی کا جاننا ضروری ہے۔ اس کی زندگی کو سمجھنے کے لیے اس کے جماعتی ماحول پر بھرپور
نظر درکار ہے۔ جماعتی ماحول میں اس جماعت کے ماضی کی ساری تاریخ کا جاننا لازم ہے۔
یہ گوہر ایسے دل کش ہیں کہ پھر کسی طرف منہ پھیرنے کو جی نہیں چاہتا۔ میں نے ابھی حضرت فغفور پر جو

تحقیقی مقالہ شایع کیا ہے اور جس پر مجمع علمی کا اوّل انعام مجھے ملا ہے وہ ۷۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔
جس میں ۳۰۰ پر شاعر کے حالات زندگی ہیں اور ان کے حالات کیا ان کے سب معاصرین کی
مختصر مگر مستند سوانح عمریاں ہیں اور ۳۵۰ صفحوں میں جماعتی ماحول پر ایسا تبصرہ ہے کہ ہندی
اور ایرانی تاریخ پر زمانۂ قدیم سے آج تک کے حوادثِ مؤثرہ پر طائرانہ نظر پڑ جاتی ہے ۔
۵۰ صفحے میں ضروری حوالے ہیں ۔ کلام جن بحروں میں ہے ان پر بحث ہے اور کلام کے
کوئی ۲۰۰ لفظوں کا فرہنگ ہے اور ایک اشاریہ ہے اور ہاں بھول گیا اسی حصّے میں اردو
میں فارسی لفظوں کے املا سے متعلق ایک مختصر مگر خاصی بصیرت افروز بحث ہے ۔"

کچھوے نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں ۔ مولانا برابر پینترا بدل رہے تھے ۔ ان کے صبر کا
پیالہ لبریز ہو گیا تھا ۔ بولے "بس جانے دو ڈاکٹر ۔ اچھے ڈاکٹر نکلے تم تو ۔ سوال کا جواب بنتا
نہیں ۔ ایران توران کے خرافات بک رہے ہو ۔"

"آپ کی گفتگو معیارِ فصاحت اور میزانِ تہذیب سے گرتی دکھائی دیتی ہے ۔"

مولانا سنبھلے اور بولے "بھائی معاف کرو ۔ آپ کے طولِ کلام سے جی جھنجھلا گیا
ہے ۔ اور پتے کی بات ہنوز ندارد ۔"

"یعنی کیا ؟" ۔

"یعنی یہ کہ اس خرگوش اور کچھوے والے قصّے کی حقیقت کیا ہے ۔"

"سنیے مولوی صاحب۔ حقیقت کا مسئلہ تو میں سمجھا چکا ہوں۔ تفصیل کروں گا تو آپ بپھریں گے۔ بات یہ ہے کہ ان جانوروں کی کہانیوں میں مصنّف جانوروں کو بہ حیثیت علَم یا نشان استعمال کرتا ہے۔ موٹی موٹی خوبیوں اور بُرائیوں کو اس میں جانوروں کی شکل میں پیش کرتا ہے جیسے ہمّت کے لیے شیر۔ لالچ کے لیے بھیڑیا۔ مکّاری کے لیے لومڑی۔ معصومیت کے لیے بھیڑ کا بچّہ۔ اقدارِ اخلاقی کی تجرید کا یہ پہلا سبق ہے۔ مکّاری یعنی لومڑی پن۔ بہادری یعنی شیرپن۔ بے رحمی یعنی بھیڑیاپن۔ تیز روی یعنی خرگوش پن۔ سست رفتاری یعنی کچھواپن۔ بچّوں کے سیدھے سادے دماغ کے لیے ان میں کشش ہوتی ہے۔ کچھ ہنسی کی باتیں بھی ہوتی ہیں جنھیں بچّے پسند کرتے ہیں۔ ان قصّوں میں جن خوبیوں کی تلقین کی جاتی ہے وہ بھی سیدھی معمولی خوبیاں ہوتی ہیں یعنی جانوروں کی صفتوں سے ملتی جلتی خوبیاں۔ اعلیٰ خوبیاں مثلاً علم۔ حُسن۔ پاسداری۔ مروّت۔ یہ ان کی پہنچ سے باہر ہوتی ہیں۔"

"بھئی ڈاکٹر کیا ذہن پایا ہے۔ کیا زبان پائی ہے۔ آپ نے۔ سارا سویرا بیت گیا۔ اور ہم ہیں کہ آپ کے دریائے خوش کلامی کے بھنور میں چکّر کاٹ رہے ہیں۔ یہ بتائیے مختصر لفظوں میں کہ اس قصّے میں کچھوا جیتا تھا یا خرگوش۔"

"جناب قصّے میں قصّہ ہوتا ہے۔ نہ کوئی ہارتا ہے نہ کوئی جیتتا ہے۔ یوں تو خرگوش ہارا تھا کچھوا جیتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ شرائط ہیں۔ خرگوش کو دوڑ میں سو جانا

چاہیے اور کچھوے کو جاگتے رہنا، چلتے رہنا چاہیے۔ اگر خرگوش برابر ہے تیز رفتاری کے اور کچھوا مرادف ہے سست رفتاری کے تو یہ نتیجہ مہمل ہے۔ لیکن اگر قصّے والا خرگوش بر خود غلط غفلت کا عَلم ہے اور کچھوا سعیِ پیہم اور بیداری کا عَلم تو یہ نتیجہ قرینِ عقل ہے۔ لیکن جناب یہ سب بتانا میرا کام نہیں۔ آپ سنیں تو کچھوے کے متعلق کچھ اور سناؤں۔ خرگوش سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ ابھی اس پر سیر حاصل مطالعہ نہیں کر پایا ہوں۔ ہاں تو کچھوے کو لیجیے۔ کچھوا امریکہ اور ایشیا کے بہت سے باشندوں کے نزدیک وہ ذی حیات ہستی ہے جس کی پیٹھ پر دنیا ٹکی ہوئی ہے۔ مُنڈاری کول لوگ اس کی پُوجا کرتے ہیں۔ کہیں کہیں اس کی قربانی بھی کی جاتی ہے۔ سچ ہے کبھی لڑھا بہلی پر کبھی بہلی لڑھے پر۔ ڈگا سکرا اور جاوا میں لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھوے کو پانی میں سے نکال لو تو طغیانی آجاتی ہے۔ بعد والی ویدوں میں کچھوے نے ایک نیم الٰہی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ یجر وید میں اسے پانی کا مالک کہا گیا ہے۔ اتھر وید میں "یہ کاشیَپ" کے نام سے پرجاپتی کے پہلو بہ پہلو دکھائی دیتا ہے۔ یا یہ خود پرجاپتی ہے جس کے لیے "سویمبھ" کی صفت آئی ہے یعنی قایم بخود۔ ستھ پتھ برہمن میں ذکر ہے کہ جب پرجا پتی نے اور چیزیں بنالیں تو خود کچھوے کا روپ اختیار کر لیا۔ شاید اسی وجہ سے ہندو دیو مالا میں کچھوے کو وشنو کا اوتار کہتے ہیں۔"

مولانا ذرا کسمسائے تو ڈاکٹر صاحب نے انگشتِ شہادت کی ایک قہرمانی حرکت

سے انھیں بولنے سے روک دیا اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھا۔

"سنیے۔ ابھی اور سنیے۔ قدیم چینی کچھوے کے خول سے غیب کی باتوں کا پتہ چلاتے تھے۔"

مولانا۔ "غیب کی باتیں۔ لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہ۔"

"یہ تو ٹھیک ہے" ڈاکٹر نے کہا "مگر چینی تو معلوم کیا کرتے تھے غیب کا حال۔ کچھوا تو اپنی جان سے جاتا تھا اور یہ اس کا اوپر کا سخت خول الگ کر لیتے تھے (کچھوا جو اُونگ گیا تھا یہاں چونک پڑا اور سہمی سہمی نظروں سے مُلّاجی کی طرف تکنے لگا۔ جب انھوں نے کچھ نہ کیا اور ڈاکٹر صاحب کی آواز آتی رہی تو اس نے پھر آنکھیں مُوند لیں) اسے الگ کر کے اندر اپنی مخصوص روشنائی ڈالتے تھے۔ ان کی روشنائی کا موضوع بھی بڑا دلچسپ ہے۔ اس کے ساتھ ان کی خطاطی اور ان کی مصوّری کے بہت سے پہلو بھی وابستہ ہیں۔ کہیے تو چلتے چلتے بتاتا چلوں۔"

مولانا۔ "لِلّٰہ رہنے دیجیے۔ علمِ غیب کا حال کیا کم تھا کہ آپ اس میں روشنائی کا قصّہ بھی ملانا چاہتے ہیں۔ جواب کیا ہوا شیطان کی آنت ہو گیا۔"

ڈاکٹر: "دیکھیے مولانا۔ یہ شیطان کی آنت جو آپ نے کہا یہ وہی حقیقتِ تخئیلی ہے۔ آپ نے نہ شیطان کو دیکھا ہے نہ اس کی آنت کو۔ نہ اسے ناپا ہے۔ مگر تخئیل میں آپ نے

شیطان کی ایک شکل بنائی ہے، کچھ صفات اس سے وابستہ کی ہیں۔ اس میں آنت بھی، نہ جانے کیوں شامل کرلی ہے۔ مگر کلام میں اس حقیقتِ تخیلی کو استعمال کرتے ہیں اور یہ ادب کا جزو ہوگئی ہے۔"

مولانا بے صبری سے بولے "معاف کرو ڈاکٹر صاحب۔ غلطی ہوئی کہ میں نے اس حقیقتِ تخیلی کو استعمال کیا۔ آپ اب جواب کو ختم کردیتے تو اچھا تھا۔ معلومات میں بے حساب اضافہ ہوچکا اور زیادہ سے ڈر ہے کہ ذہنی ہیضہ نہ ہوجائے۔"

"اور میں جو اس سے ہزار گنی معلومات اپنے اندر لیے بیٹھا ہوں مجھے ہیضہ نہیں ہوا۔ میں تو ہنوز قبض کا شکار ہوں۔ اور قبض بھی الامان۔ کیسا قبض۔ آپ کو ہیضہ ہوجائے گا۔ مگر توبہ۔ میں بھول گیا کہ کیا کہہ رہا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا مولانا۔ جلدی بتائیے ورنہ ربطِ کلام کے سب رشتے ٹوٹ جائیں گے اور میں نہ جانے کدھر بھٹک جاؤں۔"

مولانا نے کہا "مجھے بھی یاد نہیں کہ آپ کیا کہہ رہے تھے۔ آخر کوئی کتنا یاد رکھے۔ اب ختم کیجیے یہ کہانی۔"

ڈاکٹر صاحب بولے "دیکھو مولانا دورانِ کلام میں چھیڑتے نہیں ہیں۔ اس کالی داڑھی پر ایسی چُہل پھبتی نہیں۔ آپ کو سب کچھ یاد ہے۔ سارا قرآن تو حفظ ہے اور میری ذرا سی بات یاد نہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے (لجاجت سے) بتادو۔ بھائی مولوی۔ میں

کیا کہہ رہا تھا۔"

"بُرے پھنسے ہیں آج تو ۔بتانا ہی ہوگا۔آپ چینی روشنائی کا کچھ ذکر کر رہے تھے۔ یہ یاد نہیں کہ کچھوے اور خرگوش سے اس کا کیا تعلق تھا۔"

"پھر وہی خرگوش ۔میں تو کہہ چکا کہ خرگوش پر میرا مطالعہ بہت محدود ہے ۔ اور کچھوے سے تعلق ظاہر ہے ۔چینی کچھوے کے خول ہی میں تو روشنائی ڈالتے تھے ۔اور پھر اسے انگیٹھی پر سینک دیتے تھے ۔ تو روشنائی خول کی ریخوں میں اس طرح پھیل جاتی تھی جیسے کچھ لکھا ہوا ور اس تحریر کا پڑھنا وہ جانتے تھے ۔اور آنے والے واقعات کا پتہ چلا لیتے تھے ۔غرض کہ کچھوا ، مولانا ،یعنی کچھوا عجیب چیز ہے ۔اس پر ایک مستقل مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔"

مولانا بولے "لِللہ رحم کرو ڈاکٹر صاحب ۔رحم کرو۔مجھ پر اور اس غریب بوڑھے کچھوے پر۔قصور ہوا ۔بڑا قصور ہوا کہ آپ کو تکلیف دی ۔آپ مقالہ ضرور لکھیے ۔لیکن آپ ہمیں معاف کر دیجیے ۔بخش دیجیے ۔آپ کو ، آپ کے ادب اور تحقیق تنقید اور دیو مالا سب کی دہائی دیتا ہوں ۔بخش دیجیے۔"

"مولانا خفا ہونے کی کیا بات ہے"، ڈاکٹر فی الفور نے کہا "آپ نے از راہ فی الفور نوازی مجھے اس لائق سمجھا کہ ایک مسئلہ علمی میں مشورہ کریں ۔میں جو کچھ جانتا تھا

عرض کر دیا۔ سب تو خیر نہیں۔ مگر کچھ ضروری باتیں توجستہ جستہ بیان کرہی دیں۔ غالباً کفایت کریں گی۔ مزید تفصیل کی حاجت ہو تو مجھے بتا دیجیے گا۔ ضروری حوالجات دیکھ کر سب باتیں نکال دوں گا۔ حافظے پر بھروسہ نہیں رہا ہے۔ بُرا ہو اس کم بخت قبض اور بے خوابی کا۔"

مولانا کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ڈاکٹر نے کہا "اور ہاں ایک بات تو رہ گئی ___ آپ نے اپنے دوست کچھوے کو "غریب بوڑھے" کے لفظوں سے خوب یاد کیا۔ ان کی عمر کیا ہوگی۔ یہی کوئی تین چار سو برس۔ یہ تو ابھی جوان ہیں۔ آسانی سے ڈیڑھ دو سو برس اور کھینچ سکیں گے۔ کچھوے کی عمر کے متعلق۔۔۔۔۔۔۔"

مولانا نے کہا "دیکھیے بات ہو چکی۔ اب عمر کے متعلق تحقیق کا نیا باب نہ کھولیے۔ میں نے آپ کی بات مان لی۔ جب کوئی تفصیل پوچھنی ہوگی ضرور آپ سے دریافت کرلوں گا (جی میں مولانا کہہ رہے تھے لعنت ہے کمبخت پوچھنے والے پر) بلکہ آپ کچھوے پر جو مقالہ علمی لکھیں گے اسی کو پڑھ لوں گا۔ مگر ڈاکٹر اس پر پیش لفظ کسی بڑے یعنی مشہور آدمی سے ضرور لکھوانا۔ البتہ یہ یاد رہے کہ وہ علم والا نہ ہو۔ کہ علم والے بڑے اور مشہور کب ہوتے ہیں۔ اور پھر خود آپ کی تحریر کون کم بوجھل ہوگی کہ اس میں اور اضافہ کریں۔ پیش لفظ سے کہتے ہیں کہ کتاب کا وزن ذرا بڑھ جاتا ہے۔ کسی سیاسی نیتا سے لکھوا لینا جو کتاب پڑھے بغیر ہی پیش لفظ لکھ دے، وہ ذرا ہلکا پھلکا رہے گا۔"

"مولانا آپ یہ دوستانہ مشورہ دے رہے ہیں۔ یا سُوکھے منہ سے میری ہنسی اڑانے کی کوشش فرمارہے ہیں۔"

"استغفراللہ ڈاکٹر صاحب۔ میں اور آپ کی ہنسی۔ اور اس وقت تو کسی نوع ہنسنے کی طاقت باقی نہیں ہے۔"

"خیر۔ تو میں اب چلا۔" ڈاکٹر فی الفور نے کہا "آپ کو تو شاید ابھی اپنے دوست سے کچھ باتیں کرنی ہوں۔ میں خواہ مخواہ کیوں مخل ہوں۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب تو چل کھڑے ہوئے۔ دوست یعنی کچھوے صاحب پہلے مراقب سے تھے۔ پھر سو گئے تھے۔ خاموشی جو ہوئی تو چونک پڑے۔ شور میں آنکھ جھپک جائے تو خاموشی سے نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ مولانا کو اپنے دوست پر بڑا رحم آرہا تھا کہ اس غریب کی مشکل کوئی حل نہیں کرتا۔

کچھوا بولا۔ "مُلّا جی۔ کیا وہ گئے۔ تنک آنکھ مند گئی تھی۔ شما چاہتا ہوں۔ پر یہ تو بتائیے، مُلّا جی۔ میں یہ کس چکّر میں پھنس گیا ہوں۔ آپ کو بھی اتنا کشٹ دیا۔ آپ پرفسر جی کو لائے۔ ڈانگڈر جی کو لائے۔ پر ایسا لگتا ہے کہ یہ میری سمّسیا کو کچھ نہ سمجھے۔ یا ہو سکتا ہے میں نہ سمجھا ہوں کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ پر سچ یہ ہے کہ ہمارے پلّے تو کچھ نہیں پڑا۔ آپ۔ مُلّا جی سمجھے ہوں تو سمجھے ہوں۔"

مُلّا جی نے کہا "سچ کہتے ہو کچھو رام۔ میں تو بس اتنا سمجھا کہ یہ بڑے بڑے علم والے

خود بڑے مورکھ ہوتے ہیں ۔ ہمارے یہاں کہتے ہیں العلم حجاب الاکبر۔علم اتھوا ودیا بہت بڑا پردہ ہے ۔ آنکھوں پر پڑ جاتا ہے، کانوں پر پڑ جاتا ہے، دل پر پڑ جاتا ہے ۔بس زبان چلتی ہے۔ مجھے تم سے بڑی لاج آتی ہے کچھورام جی ۔کہ میں ان لوگوں کو تمھارے پاس لایا۔"

"نہیں مُلاّجی ۔آپ کیوں لجائیں ۔آپ نے تو اچھے ہی کو کیا تھا ۔ یہ میری پر ولبت کہ کچھ ہاتھ نہ آیا ۔اس کارن پوچھتا ہوں کہ جی کی بے کلی تو جاتی نہیں ۔ یہ تو کھوج لگا ہی دو۔ مُلاّجی کہ کون جیتا تھا ۔خرگوش کہ کچھوا۔"

مُلاّجی نے کہا "بھائی کچھورام ۔میں تو خود اسی سوچ میں ہوں ۔جب ڈاکٹر صاحب جانے کیا کیا اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے تو میں یہی سوچ رہا تھا کہ تمھاری گُتھّی کیسے سلجھے ۔میں نے سوچا کہ یہ کتابیں اتھوا پستک پڑھنے والے اپنی پستکوں کے بوجھ سے دب جاتے ہیں ۔خود سوچتے سمجھتے نہیں ہیں ۔اب کے کسی ایسے سے پوچھوں جو بس وچار سے عقل سے اتھوا بُدھی سے کام لے اور تمھارا پرشن حل کرے۔"

"ہاں مُلاّجی ۔اَوش یہی کیجیے ۔ایشور تمھیں اچھا رکھے ۔آپ نے تو ہمارے من میں گھر کرلیا ہے، مُلاّجی۔"

مُلاّجی نے کہا "اچھا کل میں اپنے ایک اور ساتھی کو لاؤں گا ۔ ان کا کام ہی سوچ وچار ہے ۔وہ منطق اور فلسفہ پڑھاتے ہیں اتھوا .... اتھوا .... نہیں جانتا کہ

الفيلسوف الهندی

منطق کو تمھاری بھاشا میں کیا کہتے ہیں۔"

کچھوا بولا "کہتے ہوں گے کچھ بھی۔ اس سے کیا۔ آپ جسے ٹھیک جانیں لے آئیں میری سمسیا تو کٹے۔"

اچھا تو اب جاتا ہوں۔ کل صبح "الفیلسوف الہندی" کو ساتھ لاؤں گا۔"

یہ بزرگ جن کا ذکر مولانا نے کیا مدرسے میں منطق اور فلسفے کا درس دیتے تھے۔ ان سے جب کوئی کسی مسئلے میں کسی مشہور فلسفی کا مسلک پوچھتا تو کہتے "اس کی کتاب پڑھو معلوم ہو جائے گا۔ مجھ سے میرا مسلک پوچھو۔ میں دوسرے فلسفیوں کا دلّال نہیں ہوں۔ خود فلسفی ہوں۔" خاصے ذہین آدمی تھے۔ شاگرد تو ان کے بہت کم تھے اس لیے کہ فلسفہ پڑھنے والوں کو دوسرے فلسفیوں کے مسلک جاننے ضروری تھے اور یوں بھی اب منطق اور فلسفہ کون پڑھتا ہے۔ ہاں یہ ہر صحبت میں پیش پیش رہتے۔ مباحثوں میں شریک ہوتے۔ ہر بات میں غیر متوقع باریکیاں نکالتے تھے۔ خود اپنے اوپر بھی فقرے کستے رہتے تھے۔ اس لیے لوگ ان سے اکتاتے نہ تھے بلکہ انھیں پسند ہی کرتے تھے۔

نام ان کا اصل میں اللہ دتّا تھا۔ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ مگر تعلیم جون پور اور لکھنؤ میں پائی تھی۔ اس ماحول میں اُنھیں اللہ دتّا کا نام کچھ خود ہی ناپسند ہو گیا تو انھوں

نے دیانتِ معنوی کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنا نام مولا بخش رکھ لیا۔ اس مدرسے میں ، مولانا
غفران والے مدرسے میں، آئے تو یہاں مولا بخش ایک بزرگ تھے جو بسکٹ بیچا کرتے
تھے اور فرنیچر کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ یہ ایسے کہ بسکٹ بے دریغ ادھار دیتے تھے۔ حساب
بھی زبانی رہتا تھا۔ مگر جب طالب علم مدرسہ چھوڑ کر جاتا تو قرض کی ادائی میں اس کا سارا
فرنیچر رکھوا لیا کرتے تھے۔ فرنیچر پر تو ان نئے استاد کو کوئی اعتراض نہ تھا مگر بسکٹ بیچنے
سے اپنے ہم نام کی وابستگی ان کے ذوق پر گراں تھی۔ انھوں نے سوچا کہ نام پھر ایک دفعہ
بدل ڈالیں۔ ابھی مدرسے میں آئے چند ہی دن ہوئے تھے، لوگ ان سے اور اُن کے نام
سے پورے پورے واقف بھی نہیں ہو پائے تھے۔ تقرر کا کاغذ بھی نہیں ملا تھا۔ انھوں نے
شیخ سے کہا کہ میرا نام کاغذات میں "الفیلسوف الہندی" درج کیا جائے کہ اس سے میری صحیح
پہچان ہو سکے گی۔ ورنہ مماثلتِ اسم سے مماثلتِ مسمیٰ کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور یوں اوٹ
پٹانگ نام سے کچھ پتہ بھی نہیں چلتا کہ مسمی کی صفات کیا ہیں بغرض تعارف میں اپنے اس نئے
نام کا کارڈ بھی چھپوا لوں گا۔"

شیخ نے کہا کہ "فہم و فرزانگی، متانت و سنجیدگی، مروّت و فتوت میں آپ اپنی نظیر
ہیں" اور ایک خفیف سی زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ اس درخواست کو قبول کر لیا اور ان
بزرگ کا نام اس دن سے آج تک "الفیلسوف الہندی" ہی ہے۔ اللہ دتّا اور مولا بخش کا علم

دوچار ہی ساتھیوں کو ہے۔

بات کہاں کی کہاں پہنچی۔ خیر۔ آج صبح تو ڈاکٹر فی الفور کی باتوں میں مولانا غفران کو خاصی دیر ہو گئی تھی اس لیے سیدھے اپنے گھر آئے۔ غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کر جلدی جلدی مدرسہ گئے کہ پہلے ہی گھنٹے میں درس دینا تھا۔ دن درس اور دوسرے کاموں میں گزرا۔ شام کو مولانا "الفیلسوف الہندی" کے پاس گئے اور سارا حال انھیں سنایا۔ کیسے کچھوے سے ملاقات ہوئی۔ پروفیسر کپچاق اور ڈاکٹر فی الفور سے کیا گزری۔ کچھوے کے ساتھ اپنی دوستی اور گہری ہمدردی کا حال سنایا اور "الفیلسوف الہندی" سے کہا کہ آپ کسی طرح اس بوڑھے کی تشفّی کا سامان کیجیے۔

الفیلسوف غور سے سب سنتے رہے پھر بولے "مولانا۔ دیکھیے۔ صاف بات اچھی ہوتی ہے۔ قصّے کہانی تاریخ اور ادب سے مجھے کوئی سروکار نہیں۔ یہ تخصیص کا عہد ہے اور میں نے اپنے دماغ کو تفکّر و تعقّل کے لیے وقف کر دیا ہے۔ میں تو اس مسئلے پر خود غور کروں گا اور اگر عقلاً کچھوے کا دوڑ میں جیتنا ممکن ہوا یا لازم ہوا تو میں یہ بشارت انھیں پہنچا دوں گا۔ قصّوں کے زور پر کوئی بات بھروسے سے نہیں کہی جا سکتی۔ اچھا تو سوال کو ذرا صاف کر لوں۔ دوڑ خرگوش اور کچھوے میں ہو تو کون جیتے گا؟ بلا مزید تفصیلات کے اگر یہ سوال

کیا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ خرگوش بھی جیت سکتا ہے اور کچھوا بھی۔ حالات اور عوارض پر فیصلہ ہوگا کہ کون جیتے گا۔ مفروضہ غالباً یہ ہوگا کہ خرگوش تیز دوڑتا ہے اور کچھوا آہستہ آہستہ چلتا ہے، مگر یہ مفروضہ قطعی نہیں۔ اگر تجربے پر مبنی ہے تو خود تجربہ عقلاً کوئی فیصلہ کن چیز نہیں۔ اسے تو بہت آسانی سے مجروح کیا جا سکتا ہے۔ تجربہ ہر روز صبح سے شام تک جھوٹ بولتا ہے۔ دھوکے دیتا ہے۔ ریت کو پانی بتاتا ہے۔ سورج کو زمین کے گرد گھومتا دکھائی دلاتا ہے۔ وغیرہ۔

اچھا مولانا رات میں اس مسئلے پر غور کر لوں گا اور صبح آپ کے ساتھ چل کر کچھوے سے ملوں گا۔"

۴۶

صبح صبح مولانا فیلسوف کے مکان پر پہنچ گئے۔ دونوں ساتھ ساتھ دریا پر گئے۔ کچھوا حسبِ معمول نہ جانے کب سے منتظر بیٹھا تھا۔ دونوں کو دیکھ کر باچھیں کھل گئیں۔ بولا "آؤ، مُلّاجی، آؤ۔ اور مہودے تم بھی پدھارو۔"

مُلّاجی نے کہا "کچھو رام۔ یہ میرے دوست "الفیلسوف الہندی" ہیں میں نے انھیں بتا دیا ہے کہ تمھیں کیا پرشن ستا رہا ہے۔ یہ اسے اچھی طرح سوچ کر آئے ہیں اور تمھیں سب اونچ نیچ سمجھا دیں گے۔"

"پالاگن مہاشے جی" کچھوے کی زبان پر فقرا اور ڈانگدر پر تو ٹوٹ گئی تھی مگر یہ

الفیلسوف الہندی کی ترکیب اس کی پکڑ سے باہر تھی) "اور مُلّاجی، اونچ نیچ کی اس میں کون سی بات ہے۔ بس اتنا بتادیں کہ خرگوش جیتا تھا کہ کچھوا۔ پکّی بات ہوجائے کہ کچھوا جیتا تھا تو ہم توکل ہی خرگوش سے دوڑ بدلیں۔"

"الفیلسوف الہندی" نے کہا "جناب کچھوے صاحب۔ آپ میرے دوست مولوی غفران کے دوست ہیں۔ انھوں نے مجھے آپ کا سوال بتا دیا ہے۔ مگر میں یہ نہیں بتا سکتا کہ جیت کس کی ہوئی تھی۔ میں دوڑ کے وقت کچھ کھڑا دیکھ تو رہا نہیں تھا۔ اور دیکھ بھی رہا ہوتا تو کب ضرور ہے کہ جو میں نے دیکھا تھا وہی ٹھیک ہوتا۔ دیکھنے میں بھی تو بڑے بڑے دھوکے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ بات خارج از بحث ہے کہ کیا ہوا تھا۔"

(کچھوے نے بڑی مسکین آنکھوں سے مُلّاجی کی طرف دیکھا۔ شاید یہ "خارج از بحث" اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ مگر مولانا نے اشارہ کیا کہ چپ رہو سنے جاؤ یا سہے جاؤ۔ پوری بات کہہ لیں گے تو سب سمجھ میں آجائے گا۔ بیچ بیچ میں ذرا غوطہ لگے تو سنبھل جانا)۔

"کم سے کم میرے لیے اس کا ہونا نہ ہونا ایک سا ہے۔ سوال تو یہ ہے اگر تم میں اور خرگوش میں دوڑ ہو تو کون جیتے گا۔ کون جیتا تھا نہیں۔ کون جیتے گا۔ ماضی کی تکرار مستقبل میں لوازمِ عقلی سے نہیں ہے۔" (کچھوے نے پھر مُلّاجی کا منہ تکنا شروع کیا۔ مُلّاجی نے پھر وہی پُر معنی اشارہ کیا)۔

ہاں۔ کون جیتے گا۔ یہ سوال تین حال سے خالی نہیں۔ پہلی حالت یہ کہ خرگوش تیز دوڑے۔ تم آہستہ آہستہ چلو۔ وہ بھی برابر دوڑتا رہے اور تم بھی برابر چلتے رہو تو پھر تم ہارو گے۔ خرگوش جیتے گا۔"

کچھوے نے ایک گہری سانس کھینچی۔ آنکھیں ذرا ذرا سی ہی سہی نم ہوگئیں۔ بولا "تو یہ جو ہم نے سُن رکھا تھا سب جھوٹ تھا۔ خرگوش جیتے گا۔"

الفیلسوف الہندی نے کہا "کچھوے صاحب۔ جلدی نہ کیجیے۔ میں نے جو بات کہی ہے وہ پہلی صورت ہے اور اس کے ساتھ شرطیں ہیں۔ یہ شرطیں کہ خرگوش تیز دوڑتا ہے، آپ آہستہ آہستہ چلتے ہیں، اور آپ دونوں برابر چلتے رہتے ہیں۔ تو ایسی حالت میں خرگوش جیتے گا۔"

" تو مہاشے اور کیا حالت ہوگی۔ یہی تو ہے۔ تو پھر میرا ہارنا ہی اَوش ہے۔"

" نہیں صاحب۔ صبر کرو صبر۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ تیز چلتے ہیں۔ خرگوش آہستہ چلتا ہے اور آپ دونوں برابر چلتے رہتے ہیں۔ ایسی صورت میں آپ جیتیں گے۔"

" میں جیتوں گا۔"

" ہاں۔ ضرور جیتیں گے۔ اگر شرطیں پوری ہوں کہ آپ تیز چلتے ہوں اور خرگوش سست چلتا ہو اور آپ دونوں برابر چلتے رہیں۔"

''مُلّاجی'' ۔کچھوے نے حسرت بھری آواز میں کہا۔''مُلّاجی، کیا یہ ہماری ہنسی کر رہے ہیں۔ یہ شرط پوری ہوتی تو ہم ان سے پوچھتے ہی کیوں۔اتنا تو ہم بھی سمجھتے ہیں۔ہم تیز ہوتے اور وہ سست تو ہم جیت ہی جاتے۔ اس میں پوچھنے گچھنے کی کیا بات تھی۔''

''نہیں نہیں کچھوے صاحب۔بات صاف ہے۔شرط پوری نہیں ہوگی تو آپ نہیں جیتیں گے۔مگر سنیے۔ایک صورت اور بھی ہے کہ خرگوش ہی تیز دوڑتا ہے اور آپ سست ہی چلتے ہیں۔مگر آپ تو برابر چلتے رہتے ہیں اور خرگوش بیچ ہی میں کہیں سوجاتا ہے۔تو پھر اگر وہ بروقت اُٹھ نہ جائے اور پھر دوڑنے نہ لگے۔تو آپ آہستہ آہستہ چل کر بھی جیت جائیں گے۔''

''میں جیت جاؤں گا۔''

''ہاں ۔یہی کہہ رہے ہیں۔مگر یہ بھی تو شرط لگا رہے ہیں کہ خرگوش رستے میں سوجائے۔''

''مُلّاجی۔تو وہ سوئے گا کیوں۔اُسے بھلا کون سُلائے گا۔''

الفیلسوف الہندی نے کہا ''اگر خرگوش سوئے گا نہیں یا ٹھہر نہیں جائے گا یعنی اگر وہ ٹھیک سمت میں اپنی مقررہ رفتار سے جو آپ کی رفتار سے تیز ہے حرکت کرتا رہے گا تو پھر تو پہلی صورت ہوگی جو میں نے بیان کی تھی اور خرگوش جیتے گا۔''

کچھوے نے پھر ایک ٹھنڈی سانس کھینچی اور کہا ''پھر وہی خرگوش ہی جیت جائے گا۔''

مُلّاجی نے کچھوے کو دلاسا دیا اور کہا "گھبراؤ نہیں۔ یہ ایک ایک حالت الگ الگ بیان کر رہے ہیں۔ اب تک انھوں نے جو صورتیں بیان کی ہیں ان میں تم ان دو صورتوں میں جیت سکتے ہو کہ خرگوش دوڑ میں سو جائے۔ رُک جائے۔ یا پھر تم خرگوش سے زیادہ تیز دوڑو۔"

الفیلسوف نے کہا "نہیں مُلّاجی۔ پوری بات کہیے کہ دو صورتوں میں شرط یہ بھی ہے کہ خرگوش کی رفتار تیز ہو اور کچھوے کی سُست اور ایک میں شرط یہ ہے کہ کچھوے کی رفتار تیز ہو اور خرگوش کی سست۔"

مُلّاجی نے کچھوے کی وکالت کرتے ہوئے کہا "حضرت الفیلسوف الہندی یہ تو ظاہر ہی ہے کہ خرگوش کی رفتار تیز ہے اور کچھوے کی سست اور یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ کچھوا خرگوش سے تیز نہیں دوڑ سکتا۔"

الفیلسوف نے جواب دیا "ہوگا مُلّاجی۔ لیکن میں یہ نہیں کہتا نہ کہہ سکتا ہوں۔ یہ تجرباتی علم ہے۔ ہو بھی سکتا ہے۔ نہیں بھی۔ یہ کوئی لازمِ عقلی نہیں۔ تجربے کو دلیل میں ملانے سے جو دھوکے ہو سکتے ہیں ان کی طرف پہلے اشارہ کر چکا ہوں۔ عقل مندوں کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ میرا معاملہ تو لوازمِ عقلی سے ہے، ظن و تخمین پر اور لوگ اپنی عمارت کی بنیاد رکھتے ہوں گے۔"

"میں آپ سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ اور آپ سے بحث میں بھلا کون جیت پائے گا۔ مگر سیدھی بات یہ ہے کہ میں بھی جانتا ہوں اور میرے دوست کچھوا مہاراج بھی جانتے ہیں کہ خرگوش تیز دوڑتا ہے اور یہ آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ اس لیے دوسری صورت جو آپ نے بیان کی وہ پیدا نہیں ہوگی۔ رہی تیسری اس پر کسی کا قابو نہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ خرگوش سو جائے گا یا بیچ ہی میں رُک جائے گا۔ غیر متحرّک ہو جائے گا۔"

"تو جناب والا پھر وہ ہوگا جو عقل کہتی ہے کہ ہوگا۔"

"مانا۔ لیکن کیا کوئی اور صورت آپ نہیں نکال سکتے کہ اگر رفتار کے متعلق ہمارا اندازہ صحیح ہو تو بھی کچھوا جیت جائے۔"

"آپ پوری بات بھی تو سنیں۔ میں نے کیا ساری عمر بھاڑ جھونکا ہے کہ کچھوے کے جتانے کی شرائط عقل کے زور سے نہ نکال سکوں گا۔ مگر آپ سنیں بھی۔"

کچھوے کے جان میں جان آئی۔ بولا "مہاشے جی بتائیے یہ کیسے ہوگا۔"

مُلّا جی بھی بولے "ہاں حضرت الفیلسوف۔ ضرور ارشاد ہو۔"

فیلسوف نے کہا "فرض کرتا ہوں، آپ کے اصرار پر فرض کرتا ہوں، عقلاً تو یہ لازم نہیں کہ خرگوش تیز دوڑے اور کچھوا سست چلے۔ مگر فرض کیے لیتا ہوں کہ ایسا ہی ہے۔ لیکن اس خیال سے کہ آپ دونوں بھی اپنے دماغ پر ذرا زور ڈالیں اور میری باتوں کو

سمجھنے کی کوشش کریں، ایک سوال آپ سے پوچھتا ہوں۔ یہ جو آپ خرگوش اور کچھوے
کی رفتار کے متعلق مجھے بتا رہے ہیں یہ خشک زمین پر ہوگی یا پانی کے اندر۔"
کچھوے نے کہا" مہاشے جی۔ پانی کے بھیتر کی آپ نے اچھی کہی۔ وہاں بیچارے
خرگوش کی کیا چال۔ وہ تو پانی میں اترتے ہی دو ڈبکیاں کھائے گا اور مر جائے گا۔ میں تو
پانی میں خاصا تیز تیرتا ہوں۔"
"تو پھر میری بات سمجھنے میں آپ نے اس کا لحاظ کیوں نہیں رکھا۔ اور میں نے اگر
رفتار سے متعلق مشروط بیان دیے تو آپ کو تعجب کیوں ہوا؟"
مُلاّجی بیچ میں بولے" معاف کیجیے۔ جیسے ہم ویسی ہماری سمجھ۔ آپ تو یہ بتائیے کہ
خشکی پر دوڑ ہو اور رفتار کے معاملے میں ہمارا خیال صحیح ہو کہ خرگوش تیز دوڑتا ہے اور کچھوا سست
چلتا ہے تو کوئی صورت کچھوے کے جیتنے کی ہو سکتی ہے۔"
"مُلاّجی۔ آپ تو بھول بہت جلد جاتے ہیں۔ ایک صورت بتا تو چکا ہوں کہ خرگوش
دوڑ کے دوران میں حرکت بند کر دے۔"
"جی۔ جی۔ وہ تو آپ فرما چکے ہیں۔ مگر اس کے علاوہ بھی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔"
"ہاں ہو سکتی ہے۔ اور آپ نے کل شام جب مجھ سے اس معاملے کا ذکر کیا تھا اس
وقت سے میں اس کے سوچ میں پڑ گیا ہوں۔ ایک صورت عقلاً کچھوے کی جیتنے کی نکلی ہے۔"

"وہ کیا ہے۔ مہاشے جی"۔ مُلّاجی نے بھی بڑے اشتیاق سے کہا "ہاں وہ بتائیے۔
اسی کا تو انتظار ہے"۔

دیکھیے اس کی شرطیں بھی سمجھ لیجیے۔ شرطیں یہ ہیں کہ ——

دوڑ کی سمت صحیح مقرّر ہو

دوڑ کی مدّت مقرّر ہو

خرگوش اور کچھوا دونوں مقرّر سمت میں اپنی اپنی رفتار سے برابر بلا وقفہ متحرّک رہیں۔

اور سب سے اہم شرط یہ ہے کہ دوڑ شروع ہوتے وقت خرگوش سے کچھوا کچھ نہ کچھ فرض کیجیے گز بھر، آگے ہو"۔

کچھوا نہایت توجہ سے سنتا رہا۔ مُلّاجی نے کہا "یہ شرطیں تو پوری ہو سکتی ہیں۔ پہلی تین تو صاف ہیں، چوتھی بھی طے ہو سکتی ہے۔ دوڑ سے پہلے خرگوش کو، کہ اپنی سبک رفتاری کا بڑا گھمنڈ رکھتا ہے، آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ کچھوے کو اپنے سے دو قدم آگے رکھے اور پھر دوڑ شروع ہو۔ مگر یہ تو بتائیے کہ اس حالت میں بھی کچھوے کی جیت کیسے ہوگی"۔

"ذرا غور سے سنیے اور ذہن نشین کرنے کی کوشش کیجیے۔ کچھوے اور خرگوش کو

بھول جائیے۔ میں مجرّدات سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔"

"مہاشے جی۔ آپ نہ جانے کیا کرنا چاہتے ہیں۔ مگر بات تو میری اور خرگوش ہی کی ہے۔ انھیں بھول جائیے تو پرشن ہی پھر کہاں رہا۔ کرپیا بتائیے کہ خرگوش اور کچھوے کی دوڑ میں کچھوا کیسے جیتے۔"

"ملّا جی۔ میں مقولاتِ عقلی سے بحث کر رہا ہوں۔ آپ کے دوست شاید اسے نہ سمجھ سکیں۔ آپ سمجھ لیں گے۔ پھر آپ انھیں سمجھاتے رہیئے گا۔"

"فرمائیے۔"

"فرض کیجیے دو جسم ہیں۔ الف اور ب۔ دونوں ایک خطِ مستقیم پر واقع ہیں۔ ایک آگے ہے، ایک پیچھے۔ ان کے درمیان فاصلہ ہے ف۔ دونوں جسم متحرّک ہیں، اور اپنی اپنی رفتار سے مسلسل حرکت کرتے ہیں۔ خطِ مستقیم کے ساتھ ساتھ ایک ہی سمت میں۔ اب چند کلّیات کو ذہن نشین کیجیے۔ رفتار اور وقت اور فاصلے سے متعلق۔ دیکھیے۔ کوئی جسم کتنی ہی تیزی سے حرکت کر رہا ہو اسے ہر فاصلہ کے طے کرنے میں کچھ نہ کچھ وقت لگتا ہے۔ چاہے فاصلہ کم ہو چاہے زیادہ۔ مگر مثبت رقم ہو۔

دوسرا کلّیہ یہ ہے کہ یہ متحرّک جسم چاہے اس کی رفتار کتنی ہی ہو۔ کتنی ہی تیز کتنی ہی سست۔ اگر وہ اپنی حرکت کسی ایک سمت میں برابر جاری رکھے تو کچھ نہ کچھ فاصلہ ضرور

طے کرلیتا ہے۔ چاہے یہ کچھ نہ کچھ فاصلہ کتنا ہی ہو۔ بہت یا تھوڑا۔"

مولانا بولے "یہ دونوں کلیے تو بدیہی معلوم ہوتے ہیں۔"

"بس جی خوش کردیا مولانا آپ نے۔ یہی تو بات ہے۔ بدیہی ہیں۔ بداہت وہ ہے جس کے خلاف عقل تصوّر نہ کرسکے۔ ہاں۔ یہ باتیں جو میں نے کہیں ان میں بداہت کی صفت ہے۔"

"مگر یہ تو کہیے" مولانا بولے "کہ ان کا تعلق خرگوش اور کچھوے کے معاملے سے کیا ہے۔ مجھے تو، آپ جانتے ہیں، اس مسئلے کی فکر ہے۔"

"میں نے سب کچھ تو بتا دیا۔ ایک خرگوش اور کچھوے کا کیا۔ کائنات کے جملہ متحرّک اجسام کا تطابق میرے قول سے کرلیجیے۔ اس لیے میں نے خرگوش اور کچھوے کا نام لے کر ذکر نہیں کیا۔"

"پھر بھی بتائیے تو ذرا کہ یہ کلیّے اس کچھوے کے سوال پر کیسے لاگو کیے جائیں۔"

"سنیے۔ ایک خطِ مستقیم پر جو کہیے شرقاً غرباً کھنچا ہوا ہے دو اجسام رکھے ہیں۔ الف اور ب۔ ب الف سے کچھ آگے ہے اور ان کے درمیان فاصلہ ف ہے۔ مانا کہ الف بہت تیز رفتاری سے حرکت کرتا ہے۔ مگر کلیّہ نمبر ۲ کی رو سے یہ کتنی ہی تیز رفتار سے چلے فاصلہ ف کے طے کرنے میں کچھ وقت اسے ضرور لگے گا۔ اس وقت کو د کہہ لیجیے۔ ادھر ب بھی برابر

حرکت کر رہا ہے۔ چاہے کتنی ہی کم رفتار سے حرکت کر رہا ہو یہ وقت د میں کلیہ نمبرا کی رو سے
کچھ نہ کچھ فاصلہ طے کرے گا جسے ف(۱) کہیے۔ اس مثبت فاصلہ ف(۱) کے طے کرنے
میں الف کو چاہے کتنا ہی تیز رفتار ہو کچھ نہ کچھ وقت لگے گا۔ اس وقت میں ب جو برابر
متحرّک ہے کچھ فاصلہ طے کرے گا جسے ف(۲) کہہ سکتے ہیں۔ جب تک الف یہ ف (۲)
طے کرے گا ب ف(۳) طے کرے گا۔ یہ ف(۱) ف(۲) ف(۳) کتنے ہی کم ہوں مگر
بہرحال مثبت فاصلے ہیں جن کے طے کرنے میں الف کو کچھ نہ کچھ وقت لگے گا۔ اس وقت
میں ب کچھ نہ کچھ آگے بڑھ جائے گا۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور ب اور الف میں کچھ نہ
کچھ فاصلہ ضرور رہے گا اور الف ب کو نہ پکڑ سکے گا۔ چنانچہ دوڑ میں ب کی جیت لازم
ہے۔ عقلاً لازم ہے۔"

مولانا متحیّر و ششدر فیلسوف کا منہ تک رہے تھے۔ کچھوے کے چہرے پر بشاشت کے
کچھ عجیب آثار نمایاں تھے۔ ذرا رُکتے رُکتے بولا "مُلّا جی۔ مہاشے جی جو کہہ رہے ہیں وہ
سب تو ہم نہیں سمجھے۔ پر ایسا لگتا ہے کہ ہم جیت جائیں گے۔ ذرا یہ کھول کے کہہ دیتے
تو ان کا کیا بگڑتا کہ کچھوا جیتے گا۔"

فیلسوف مسکرا دئے اور اس سے زیادہ خوشی کا اظہار فیلسوف شانِ علم سے فروتر سمجھتے
تھے۔ مسکرائے اور کہا "سارا مسئلہ پانی کر دیا۔ اور آپ کی فرمائش ابھی باقی ہے کہ کھول کر بیان کردوں۔

مُلّاجی ۔ الف کی جگہ خرگوش کو رکھنا چاہو تو خرگوش کو رکھ دو۔ ب کی جگہ کچھوے کو رکھ دو۔ دونوں کے بیچ میں فاصلہ ف گز بھر کا بھی رکھ دو اور پھر دوڑ شروع کراؤ۔ کچھوے صاحب اگر اپنی رفتارِ مقرّرہ سے چلتے رہے ٹھہر نہ گئے، سو نہ گئے، تو جیت ان کی ہوگی۔ لازم عقلی ہے، لازم عقلی۔ اس میں تجربے کے فریب اور قیاس کے دوغلے پن کو دخل نہیں ہے۔"

مُلّاجی بولے "سمجھے کچھو رام۔ دوڑ بدلو۔ مگر یہ نہ بھولنا کہ دوڑ شروع ہوتے وقت تم خرگوش سے گز بھر بلکہ احتیاطاً دو گز آگے رہنا۔ پھر وہ تم سے آگے نہیں نکل سکے گا، ہمارا فیلسوف تو سچ ہے بڑی دُور کی کوڑی لایا۔ ہماری تمھاری سمجھ یہاں تک بھلا کیسے پہنچتی۔"

مُلّاجی ۔ ان کے منہ سے کہلوا دو کہ ہم جیت گئے۔"

"دیکھو کچھو رام جی" فیلسوف نے کہا "ہمیں یہ توہّم پرستی اچھی نہیں لگتی۔ اِس سے کہلا دو۔ اُس سے کہلا دو۔ ہم کیا جانیں کہ تم جیتو گے یا وہ جیتے گا۔ ہمارے نقشے کے مطابق دوڑ ہوگی تو ب جیتے گا۔ مُلّاجی تمھیں ب بنا دیں تو ان کی خوشی اور تمھاری ہمت۔ شرطیں پوری ہوں گی تو ب جیتے گا۔ اور شرطیں پوری نہ ہوں گی تو سارا قصّہ ہی ختم۔ خرگوش بھی ختم۔ کچھوا بھی ختم۔ پھر جو ہوگا اس کا دوسرا نقشہ ہوگا۔"

مُلّاجی ۔ کیا ہم سے کوئی بھُول مہاشے کے وِشے میں ہوگئی جو یہ سب کچھ بھسم کئے دیتے ہیں شبد سب ان کے سمجھا نہیں ہوں۔ پر جس گڑگڑاہٹ سے انھوں نے "ختم" "ختم"

کہا اس سے سمجھتا ہوں کہ ان کا مطلب ہے بھسم۔ خرگوش بھی بھسم۔ ہم بھی بھسم"۔

"نہیں نہیں۔ کچھورام۔ ان کے دماغ پر اس پرشن کا اثر دینے میں ذرا زور زیادہ پڑ گیا ہے۔ بات تو انھوں نے صاف کر دی ہے۔ ہم نے جیسا تمھیں سمجھایا ہے ویسا کرنا، ضرور جیتو گے۔ مگر دیکھو بھائی گز دو گز آگے ضرور رہنا شروع کرتے وقت۔ کہیں یہ شرط نہ بھول جانا"۔

"شرط بھول جائیں گے تو سب نقشہ ختم۔ اذا فات الشرط فات المشروط۔ اب آپ انھیں سمجھاتے رہیں میں تو چلا۔ سر میں درد ہونے لگا۔ حضرت الاستاذ کی تاکید ہے کہ جب کوئی مسئلہ ایسا ہو کہ عقل پر زور دینا پڑے تو اس کے بعد کوئی مقوّیِ دماغ چیز ضرور جسم کو پہنچانی چاہیے۔ یوں تو عقل مجرّد ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ ازل سے ہے ابد تک رہے گی۔ اسے تھکنے سے کیا کام۔ مگر انسان میں آ کر اس کا رابطہ دماغ سے ہو گیا ہے اور دماغ بہرحال جسم ہے۔ یہ تھک جاتا ہے۔ سوار نہیں تھکتا۔ گھوڑا تھک جاتا ہے۔ اسے دانا دینا ہوتا ہے۔ میں تو شیرہ مغز بادام، شیرہ تخم خیارین، شیرہ تخم کدو شیریں مصری ملا کر پی لیتا ہوں۔ بہت مفرّح ہے اور مقوّی دماغ۔ بس۔ سلام علیکم۔ خدا حافظ"۔

مُلّاجی نے کہا "ٹھہرو ٹھہرو۔ میں ذرا دو باتیں ان سے کر لوں۔ میں بھی ساتھ

ہی چلتا ہوں۔ خاطر جمع رکھیے آپ کے شیرے میں شرکت نہیں کروں گا۔ بھاگیے نہیں۔"

"جی نہیں۔ جناب ہم تو اب چلے۔"

مُلّا جی بولے "اچھا جائیے۔ پھر ملیں گے۔ بہت بہت شکریہ۔ آپ نے آج بڑا کام کر دیا۔ اور بھائی کچھورام دیکھو تمھارے پرشن کا اُتّر ہمارے الفیلسوف الہندی نے کیا دیا ہے، کمال کر دیا، کمال۔ ایسا گھیرا ہے سوال کو کہ سارے دروازے فرار کے بند۔ اب ہم بھی چلے۔ تم اب دل سے الجھن کو دُور کر دو۔ خرگوش اب تمھارے سامنے اترائے، تمھیں چنوتی دے، تو دوڑ بد ہی لینا۔ وہ شرط آگے رہنے والی شرط یاد رہے۔ جیتو گے، ضرور جیتو گے۔ اچھا ہم بھی چلے۔"

"مُلّا جی۔ دھن واد۔ ہردے سے تمھارا کرتگیہ ہوں۔ تم نے میرے جی کا کانٹا نکال دیا۔ بہت آبھار مانتا ہوں تمھارا۔ اچھا جاؤ۔ پر پھر ملنا اَوَش۔"

"اس میں دھن واد کی کیا بات ہے۔ مجھے تو خود تمھارے پرشن سے دل چسپی ہو گئی تھی اور پروفسر کپچاق اور ڈاکٹر فی الفور نے جس طرح تمھارا اور میرا سر کھایا اور ایک بات پتے کی نہ کہی اس سے مجھے بڑی شرم تھی۔ ہم علم والے کس کام کے کہ تمھاری مشکل میں تمھیں ذرا سہارا نہ دے سکے۔ مگر "الفیلسوف الہندی" نے سچ ہے حق ادا کر دیا۔ جی تو اس کی باتوں سے بھی بہت اُلجھا مگر اس لیے نہیں کہ اس کی باتوں میں اُلجھاؤ تھا بلکہ

اس لیے کہ وہ اتنی صاف تھیں کہ اُلجھی معلوم ہوتی تھیں ۔ اور سب سے مشکل بات یہ تھی کہ ایک ساتھ ایک ہی وقت میں کئی کئی شرطوں کو خیال میں رکھنا ہوتا تھا ۔ بارے بات صاف ہو گئی ۔ بہت اچھا ہوا ۔ بس اب رخصت "۔

یہ کہہ کر مولانا غفران خوش خوش تیز تیز ڈگ بھرتے گھر لوٹے ۔ نہائے دھوئے ناشتہ کیا ۔ سیدھی سادی چائے اور مولا بخش کے دو علی گڈھیے قسم کے بسکٹ کھائے تو ان کا دھیان فیلسوف کے شیرۂ مغز بادام کی طرف ضرور گیا ۔ مگر اس وسوسے کو دفع کر کے یہ اپنا کلاس پڑھانے اور اس کے بعد اپنی سب جماعتوں کو سالانہ امتحان کا نتیجہ سنانے چلے گئے ۔

امتحان میں انھوں نے ایک لڑکے کو ۵۰ میں سے ۵۵ نمبر دیے تھے ۔ نتیجہ سُناتے وقت صدر مدرس صاحب بھی موجود تھے ۔ وہ لڑکوں کے سامنے تو کچھ نہ بولے پر جب مولانا کلاس سے نکلے تو پوچھا "مولانا یہ ۵۰ میں سے ۵۵ کیسے آپ نے نکالے "۔

"میں نے کہیں سے نہیں نکالے" مولانا نے کہا ۔ "میں نے اپنی طرف سے صفی کو ۵۵ نمبر دیے ہیں "۔

"مگر مولانا کُل مفروضہ نمبر تو ۵۰ ہی تھے "۔

"جی ۔ ضرور تھے ۔ مگر مفروضہ ہی تو تھے ۔ میں نے جمیل کی کاپی دیکھی تو اس نے ماشاء اللہ سب سوالوں کے جواب ٹھیک لکھے تھے ۔ میں نے اسے ۵۰ نمبر دے دیے ۔

پھر جب وصی کی کاپی دیکھی تو اس نے بھی سب سوال ٹھیک کیے تھے۔ خط اس کا جمیل سے اچھا تھا اور لکھنے کا انداز بھی مجھے زیادہ پسند آیا۔ اب یا تو میں اسے ۵۰ دیتا اور جمیل کے نمبر گھٹاتا تاکہ ان میں صحیح نسبت قایم رہے۔ یا وصی کو زیادہ نمبر دیتا۔ پہلی صورت مجھے قرینِ انصاف نہیں لگی۔ اس لیے دوسری صورت اختیار کی۔"

یہ دونوں باتیں کرہی رہے تھے کہ سامنے سے فیلسوف گذرے۔ جماعت پڑھا کر آرہے تھے۔ صدر مدرس نے ان سے کہا "حضرت فیلسوف ذرا سنیے۔ مولانا غفران نے ۵۰ میں سے ۵۵ نمبر ایک طالب علم کو دیے ہیں۔ آپ کیا فرماتے ہیں۔"

"میں کیا فرماؤں۔ ۵۵ دیے ہیں تو ۵۵ دینے چاہیے ہوں گے۔"

"مگر حضرت فیلسوف۔ کم میں سے زیادہ کسی کو کوئی کیسے دے سکتا ہے۔ ان کے ہاتھ میں کل ۵۰ نمبر تھے اور دے دیے انھوں نے ۵۵۔ یہ کیسے ممکن ہے۔"

"ممکن۔ ایسے کہ انھوں نے دے دیے۔ امکان تو واقعے سے ثابت ہے۔ رہا کم و بیش کا معاملہ تو یہ اعتباری تصوّرات ہیں۔ ۵۰ نمبر مفروضہ ہیں۔ ۵۵ ان کے دیے ہوئے نمبر ہیں۔ ان کا مقابلہ کیا اور کیسے۔ امرود میں سے آم کوئی نہیں دے سکتا۔ انھوں نے مفروضہ ۵۰ میں کچھ نہیں دیا ہے۔ اپنی رائے کے مطابق لڑکے کو نمبر دیے ہیں ۵۵۔ جی چاہتا ۶۰ دیتے۔ ۷۰ دیتے۔ اور دے دیتے تو امکان کا سوال تو اٹھتا ہی نہیں۔ کردم و

کا معاملہ ہوتا۔"

"معاف کیجیے حضرت فیلسوف اور معاف فرمائیے مولانا۔ آپ نے جو کیا وہ ٹھیک ہی ہوگا۔ مجھے نتیجہ یک جا کرکے سرپرستوں کو بھیجنا ہے۔ دفتر جاتا ہوں۔"

دفتر میں صدر مدرس صاحب نے اپنے منشی سے کہا "بھائی وہ نویں جماعت کا دینیات کا نتیجہ جو مولوی غفران بھیجیں اسے ذرا دیکھ لینا۔ ایک لڑکے کو شاید صفی کو ۵۰ میں ۵۵ نمبر دیے ہیں مولانا نے۔ تم ۵۰ میں ۵۰ درج کرنا۔ اور جس مضمون میں اس کے کم نمبر ہوں ان میں ۵ جوڑ دینا۔"

نتیجہ تیار ہو کر سرپرستوں کو بلایا گیا۔ مدرسے میں بڑی چھٹیاں ہو گئیں۔ مولانا اور اکثر استاد اپنے اپنے وطن چلے گئے۔

ادھر کچھوے نے دوڑ کی تیاری شروع کی۔ تیاری یعنی زیادہ تر ذہنی تیاری۔ مولانا صبح صبح نہ پہنچتے تو اسے بڑی کمی سی محسوس ہوتی۔ مگر دل میں ان کے ساتھ شکرگزاری کا جذبہ اپنی پُر امید تیاری کے ساتھ ساتھ بڑھتا جاتا۔ اب انتظار اسے یہ تھا کہ خرگوش کسی دن آئے اور طعنہ دے یا چھیڑے تو اس کا چیلنج قبول کر لیا جائے۔ چنانچہ وہ شوخ سبک رفتار کئی دن پیچھے آیا۔ کنارے پر آدمیوں کی آن جان سے بھڑک گیا تھا۔ ادھر سے

بچ کر ہی نکلتا تھا۔ کچھ فاصلے پر جوچنے کا کھیت تھا اس سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ وہیں
برابر چنے کا ساگ مزے لے لے کر کھایا اور لوٹ گیا۔ کچھوے صاحب برابر پانی سے
نکل کنارے پر بیٹھے انتظار کرتے۔ انتظار کرتے کرتے تھک جاتے (اور انتظار سے
زیادہ تھکانے والا کون ہے کہ ایک ایک منٹ سال سال بھر کا ہو جاتا ہے) ہاں
انتظار کرتے کرتے تھک جاتے تو پھر پانی میں ڈبکی لے لیتے اور آن کی آن میں اپنے سارے
علاقے میں گھوم لیتے۔ جی جی میں سوچتے کہ پانی ہی میں ذرا ذرا مشق کرتا رہوں کہ مقابلے کے دن
زمین پر جلدی تھک نہ جاؤں۔ ہانپ نہ جاؤں۔ ہانپنے سے بہت گھبراتے تھے۔ دم پھولا
کہ یہ سمجھے کہ چلے۔ پانی میں ان کا دم کبھی نہیں پھولتا تھا۔

جب دو چار دن آدمی ادھر نہیں دکھائی دیے (دکھائی کون دیتا۔ مولانا تو گھر
چلے گئے تھے) اور کچھوے کو کنارے پر بیٹھا دیکھا تو خرگوش قریب گیا اور بولا:
"بڑھئو۔ یہ پوپلا منہ کیسا چل رہا ہے۔ کس سوچ میں ہو۔ آؤ کوئی کھیل کھیلیں۔ یہ
کہہ کر دوڑ کر دونوں کانوں کو کھڑا کیا۔ پھر نیچے کر لیا۔ پھر کھڑا کیا، نیچے کر لیا۔ کئی بار یہی کیا
تو کچھوے کو ایسا لگا کہ خواہی نہ خواہی یہ ہماری ہنسی اڑا رہا ہے۔ بولے "بڑے چنچل ہوتے
جاتے ہو راجکمار۔ بڑوں کا سمان بھی کوئی چیز ہے۔ تمیز کب آئے گی۔"
"کیا تیرنے میں کچھ پانی پیٹ میں بھر گیا ہے بڑھئو" خرگوش نے کہا۔ "جو ایسی

آڑی ترچھی باتیں کر رہے ہو۔"

"آڑی ترچھی باتیں تو کرتے ہو تم راجکمار۔ میں تو اپنے نیم کے انوسار رہتا ہوں۔ پرکھوں سے تمیز سیکھا ہے۔ تمیز سیکھنے کو کہتا ہوں۔"

"تو گویا میں بدتمیز ہوں۔ بدتمیز ہو گے تم۔ ذرا زبان سنبھال کر بولو۔"

"ہے رام۔ ہے رام۔ راجکمار گرم کیوں ہوتے ہو۔ ان دنوں چاروں کھونٹ ہرا ہرا بہت ہے۔ اسی مارے کچھ پھول گئے ہو۔ اپنے کو بھول گئے ہو۔"

"پھولے ہوئے ہو گے تم۔ غبّارہ تو بنے ہوئے ہو اور غبّارہ تو ہوتا ہے ہلکا۔ تم تو پتھّر کا غبّارہ ہو۔ قلعے کا قلعہ پیٹھ پر اٹھائے پھرتے ہو۔ اور ذرا چال تو دیکھیے اس چپٹے غبّارے کی۔"

۶۴

"یہ تم میری چال کو ہمیشہ اُٹکاتے ہو۔ کیسی ہے میری چال؟ میری چال ہے جیسے بھاری بھرکم لوگوں کی چال ہوتی ہے اور ہونی چاہیے۔ تمھاری چال ہے جیسے چھچھوروں کی چال ہوتی ہے۔ اِدھر اُچکے۔ اُدھر اُچکے پھاندے۔ کہیں دبکے کہیں چھپکے۔ کان نچائے، کولھے مٹکائے۔ واہ بڑی چال ہے ہمارے راجکمار کی۔"

"اچھا تو آؤ دیکھ لو کس کی چال اچھی ہے۔ اچھی سے مطلب یہ کہ کس کی چال تیز ہے۔ دوڑو گے ہم سے، موٹو میاں۔ یا کھڑے کھڑے ہی ہانپ جاؤ گے۔"
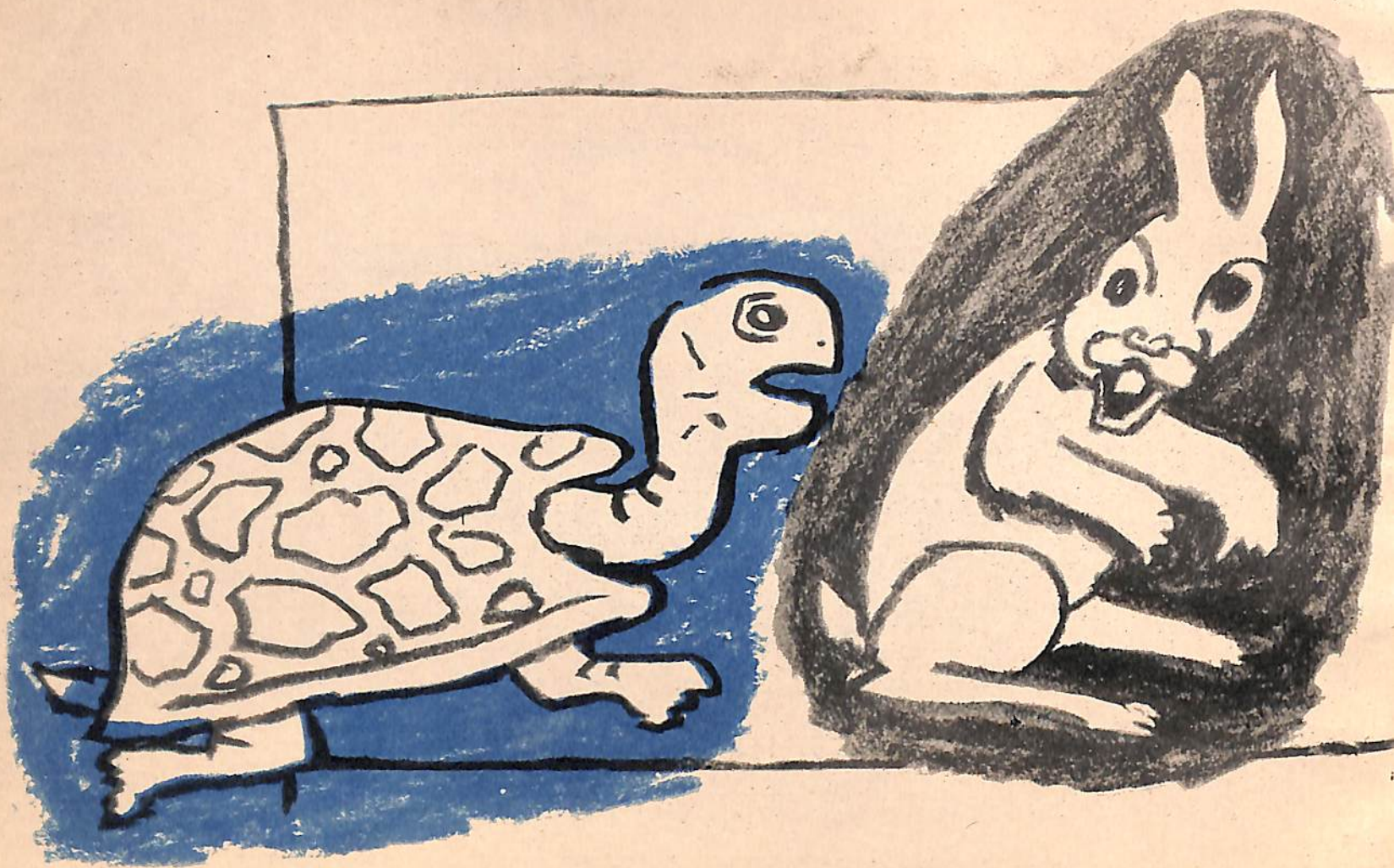
"دوڑ۔ گھڑی گھڑی دوڑ۔ پھر نکالی تم نے دوڑ کی بات۔ اچھا تو دوڑیں گے۔ پہلے بھی ایک دوڑ ہوئی تھی۔ اتہاس اور ساہتیہ میں اس کا بکھان ہے۔ جانتے ہو کیا ہوا تھا۔ اس دوڑ میں۔ تمھارے سکڑ دادا جی میرے پتا جی سے ہار گئے تھے۔ خبر بھی ہے بسنت کی، راجکمار۔"

"کیوں بکواس کرتے ہو فضول۔ لکھی ہوگی کہانی کسی سڑی نے۔ کہانیوں میں لیکھک جھوٹ نہ ملائے تو پڑھے اور سنے ہی کون۔ جھوٹ کے گرم مسالے سے کہانی ذرا چٹپٹی ہو جاتی ہے۔ پر بُڑھو۔ جیون کہانیوں پر نہیں چلتا۔ اس کے لیے چاہیے پاؤں، چست مضبوط پاؤں۔ ہمّت ہو تو دوڑ دیکھو۔"

"اچھا تو راجکمار۔ دوڑ کی ٹھن گئی۔ دوڑیں گے۔ ضرور دوڑیں گے۔ ہار جاؤ تو پھر بڑھ بڑھ کر باتیں مت کرنا۔ تمیز سے بات کرنا سیکھنا۔"

"تو پھر بولو کب دوڑو گے۔ آؤ ابھی سہی۔"

"نہیں ایسی جلدی کیا ہے۔ مجھے ابھی پانی میں تھوڑا سا کام ہے۔ کل سویرے آجانا۔"

"ضرور آؤں گا۔ تم اکیلے ہو گے نا۔ یا وہ کالی داڑھی والے اور وہ لکڑی والے اور وہ چمکیلی آنکھوں والے تمھارے نئے دوست سب ہوں گے۔ میں ان آدمیوں سے

کتراتا ہوں نزدیک نہیں جاتا۔ بڑے فریبی ہوتے ہیں یہ اور بڑے بے رحم، سفاک، خونی۔"

"ہے رام۔ ارے راجکمار تمھارے منہ سے کسی کے لیے کوئی اچھا شبد نہیں نکلتا۔ بس چنے کا ساگ اچھا اور سب بُرے۔ خیر۔ تم جانو تمھارا کام جانے۔ سویرے آنا۔ یہاں اور کوئی نہیں ہوگا۔ تم ہوگے اور میں ہوں گا اور ایشور ہوگا۔ بس۔ ہو ہی جائے دوڑ۔ اپنی لاج ایشور کے ہاتھ ہے۔"

"تم تو بڑھؤ ایسے کہہ رہے ہو جیسے ایشور کوئی تمھارا اپنا رشتہ دار ہے کہ تمھاری ہی لاج اس کے ہاتھ ہے اور وہ ہمارا کوئی نہیں۔ خیر تم جانو تمھارا ایشور جانے بس یہ بتاؤ کہ دوڑ کی پکّی ہوگئی۔"

"یہاں اس ببول کی جڑ سے اُس پُلیا کے اِدھر والے ٹُنڈ تک۔ سیدھ میں یہاں سے وہاں تک۔ پر ایک شرط ہے راجکمار۔"

"وہ کیا۔"

"وہ یہ کہ ہم تم سے دو گز آگے سے چلیں گے۔"

"یہ کیوں۔"

"یہ یوں کہ تم جوان ہو ہم بوڑھے ہیں۔ ہم نے سن رکھا ہے کہ دوڑوں میں ایسا ہوتا ہے۔ سو بیکار کرتے ہو۔"
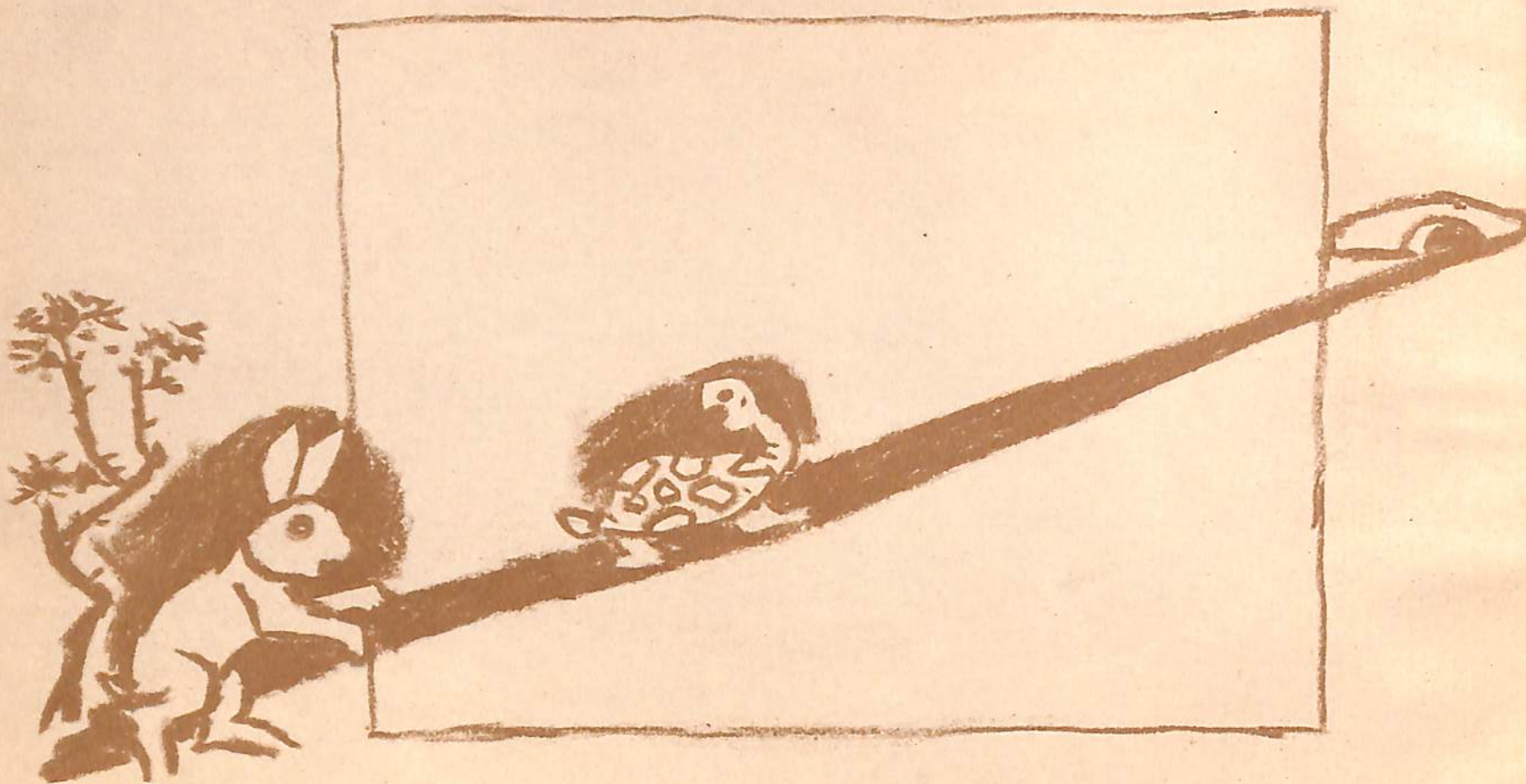
"منظور ہے مجھے۔ تم دو گز نہیں تین گز آگے سے چل سکتے ہو۔"

یہ کہہ کر خرگوش اچھلتا کودتا یہ جا وہ جا۔ کچھوا پانی میں جیسے بے زور لگائے آپ ہی آپ تیرتا ہوا کہاں سے کہاں پہنچا۔ کچھ فیصلہ کر لینے کی خوشی۔ کچھ ورزش سے اپنے جسم کو چست رکھنے کا خیال۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ بدن ہلکا پھول ہو گیا ہے اور دل آنند سے چمن چمن ہے۔

دوسرے دن صبح خرگوش چنے کے کھیت میں اوپر اوپر کی نرم نرم کونپلیں کھا کر سیدھا کچھوے کے ٹھکانے پر پہنچا۔ کچھوا پہلے سے ببول کے پاس، اس سے پُلیا کی طرف کوئی ڈھائی گز پر، منتظر بیٹھا تھا یا کھڑا۔ یہ ٹھیک نہیں کہا جا سکتا بہر حال موجود تھا۔

"نمستے راجکمار" کچھوا بولا۔

"نمستے بڑھئو" خرگوش نے گستاخی سے جواب دیا۔

کچھوا پی گیا اور بولا "میں تو اپنی جگہ پر آگیا ہوں تم ببول کی جڑ کے پاس جاؤ۔ تو دوڑ شروع ہو۔"

"شروع کب ہوگی۔"

"جب میں کہوں کہ چلو۔"

"اچھا یہی سہی۔"

دونوں اپنی اپنی جگہ پر تھے۔ اب کچھوے صاحب ہیں کہ "چلو" نہیں کہتے۔ خرگوش کی چلبلاہٹ کو صبر کہاں۔ ایک منٹ رُکا۔ دو منٹ رُکا اور دو چھلانگوں میں کچھوے کے پاس۔

کچھوا چلّایا "ابھی میں نے "چلو" کب کہا ہے۔ بے ایمانی کی ٹھانی ہے کیا۔ یہ بات پہلے ہو چکی ہے کہ دوڑ میں پہلا ڈگ دونوں ایک ساتھ اٹھائیں گے اور یہ جب ہم "چلو" کہیں۔ پلٹو اپنے استھان پر۔"

خرگوش واپس آگیا اور پھر بے صبری سے "چلو" کا انتظار کرنے لگا۔

آخر کو کچھوے نے کہہ ہی دیا "چلو"۔ خرگوش نے دو چھلانگیں ماریں اور آگے۔ کچھوے صاحب نے بھی وقار اور متانت سے حرکت شروع تو کر دی مگر حرکت اور سکون میں فرق بہت کم تھا۔ صرف یہ کہ یہ بدحواس تھے اور ہانپ رہے تھے۔ منٹوں میں خرگوش ٹُنڈ کے قریب پہنچ گیا۔ اور یہ ہانپتے کانپتے اس حقیقت کو عقل کی تسکین دہی کے باوجود اپنی آنکھوں دیکھتے رہے اور تجربے کی فریب دہی کا خیال بھی کہیں اُن کے دماغ میں نہیں آیا۔ یکایک کیا ہوا کہ پُلیا کے ٹُنڈ کو چھُونے سے ذرا ہی پہلے خرگوش نے اپنی سمت بالکل بدل دی۔ کچھوا چلّایا بھی اپنے پوپلے منہ سے "یہ نہیں بدی ہے۔ سیدھے رستے پر چلو نہیں تو میں کھڑا ہوا جاتا ہوں۔ ساری دوڑ رہ جائے گی۔"

منہ میں دانت نہیں۔ پیٹ میں سانس نہیں۔ ویسے بھی انھوں نے جو کہا وہ کسی کی سمجھ میں نہ آتا۔ مگر اس وقت تو خرگوش کچھ بھی سن نہیں سکتا تھا۔ اس نے تو منظور میاں کا شکاری کتّا، رامپوری کتا، پُلیا پر آتے دیکھ لیا تھا۔ اس کی تو ساری زندگی سمٹ کر اس کے پیروں میں آگئی تھی۔ جان بچانے کے لیے کبھی اِدھر بھاگتا کبھی اُدھر بھاگتا۔ ایک پیڑ کی جڑ میں چھپکا۔ کتا زمین سونگھتا ہوا وہاں بھی پہنچا۔ خرگوش نے ایک بڑی چھلانگ ماری جیسے ہرن چھلانگے۔ مگر کتّے نے اسے ہَوا ہی میں گُپک لیا اور کچھ اس طرح اچھالا کہ یہ ہوا میں کوئی گز بھر اوپر اچھل گیا۔ کتّے نے پھر ہوا ہی میں اسے گُپک لیا۔ پھر زمین پر چھوڑ دیا۔ خرگوش نے جو ادھ موا ہو چکا تھا ایک بار پھر دوڑنے کی کوشش کی۔ اس بار کتّے نے بالکل جھنجھوڑ ڈالا۔ پیچھے پیچھے منظور میاں آہی رہے تھے۔ کندھے پر رُومال پڑا تھا اس کے کونے میں رشید آباد کا بنا ہوا ایک بڑا سا چاقو بندھا تھا۔ انھوں نے چاقو کھولا اور خرگوش کو، کہ ابھی اس میں زندگی کی رمق باقی تھی، حلال کر ڈالا۔

یہ سارا واقعہ کچھوے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور اس پر کچھ ایسا سکتہ طاری ہوا کہ یقین نہیں آتا تھا کہ صرف خرگوش جان سے گیا ہے یا اس صدمے میں یہ بھی دنیا سے چل بسے۔ نہ جانے کتنی دیر وہیں سہمے پڑے رہے۔ آنکھ کھولتے تو دنیا سنسان خالی خالی دکھائی دیتی۔ آنکھیں بند کرتے تو سامنے وہی خرگوش اور وہی کتا دکھائی

دیتا۔ اور لال خون کی وہ پچکاری جو خرگوش کی گردن سے نکلی تھی۔ گھبرا کر آنکھیں کھول
دیتا۔ نہ جانے کتنی دیر یہی حال رہا۔ آخر یہ دریا کی طرف آہستہ آہستہ چلا۔ آپ سمجھیں
کہ جب کچھوا آہستہ آہستہ چلے تو کیا رفتار ہوگی۔ بہر حال کوئی چلتا رہے چاہے کتنا ہی
آہستہ تو فاصلہ تو طے ہو ہی جاتا ہے۔ دریا کے کنارے تک پہنچ گیا۔ پانی میں گیا۔
پھر نکل آیا اور اُسی پُلیا کی طرف تکنے لگا۔ کبھی کبھی آنکھوں سے دو بوندیں بھی ٹپک
جاتیں جن میں نہ جانے کیا خیال گزر رہے تھے۔ کہتا "بڑی ہتیا ہوئی۔ یہ مجھے کیا ہوا
تھا کہ اس رنگیلے چھبیلے جوان کو دوڑ پر اُکسایا۔ تھوک ہے ہمارے بڑھاپے پر اور ہمارے
شتابدیوں کے انبھو پر کہ ہم اس کے چبھتے کٹیلے شبدوں سے بپھر گئے اور اپنی چھاتی میں
اتنے دن کرودھ کو جی بھر کر پالا۔ اپنی آتما کو گندا کیا۔ مورکھ آدمیوں سے سانٹھ گانٹھ
کی۔ اپنی بُدھی کو بچّوں کی سی باتوں سے بہکنے بھٹکنے دیا۔ کیا تھا جو وہ جوانی کی ترنگ
میں اِتراتا تھا؟ ہمارا کیا لیتا تھا؟ کیا بگاڑتا تھا ہمارا؟ ہمیں کیسے شوبھا دیتا تھا کہ اس
لڑکے سے منہ لگائیں؟ ہم تو شتابدیاں بِتا چکے وہ تو ابھی کل کا بچّہ تھا۔ وہ جان سے
گیا اور ہم جیسے جاتے ہیں۔ اس سے اچھا تھا کہ ہمیں بھی کچھ ہو گیا ہوتا اور ہم یہ سب سوچنے
کو نہ رہتے۔ اچنبھا تو سوچ سے اب اس بُھول پر آتا ہے کہ اتنی آیو پا کر ہم اتنا نہ سمجھ
سکے کہ ہر جیو کا سنسار الگ الگ ہوتا ہے۔ ہمارا سنسار الگ۔ خرگوش کا سنسار الگ۔

ایک کے لیے جو مہتو کی چیز ہے، دوسرے کے لیے اس کا کوئی مولیہ نہیں۔ ہم زمین پر بھاگ نہیں سکتے تو وہ مرنے والا بچّہ بھی تو پانی میں نہیں تیر سکتا تھا۔ کسی کو کچھ ملا ہے، کسی کو کچھ اور۔ کسی کا کچھ کرتو ہے، کسی کا کچھ۔ سب اپنا اپنا کرتو پورا کریں تو اس میں ایشور کی مرضی پوری ہوتی ہے۔ اس مرضی کو جاننا پہچاننا اور اُس کے سامنے گردن جھکانا ہی جیون کا انس ہے۔ یہی دھرم ہے۔ یہی ستیہ ہے۔ یہی آنند ہے۔ یہی موکش ہے۔ یہ جان پہچان۔ یہ گردن جھکانا ہر ایک کا اپنے اپنے رنگ میں ہوتا ہے۔ اپنی پہچان کو دوسرے کی پہچان سے ناپنا، اپنے گردن کو جھکانے کے ڈھنگ کو دوسرے کے جھکاؤ سے ٹکرانا، دوسرے کے کرتو کو اپنے کرتو کا ترازو بنانا، یہ سب بُھول ہے۔ بڑی بُھول ہے، بڑی بُھول ہے، اور ہم سے یہی بُھول ہوئی "۔

دن جیسے تیسے کٹتے ہیں پر کچھوے کے جی کا بوجھ ہلکا نہیں ہوتا۔ سوچتا ہے کہ "ملّاجی بھی ادھر نہیں لوٹتے۔ ان سے جی کا دُکھ کہتا۔ کہتے ہیں کہ کہنے سے دُکھ کچھ مدّھم پڑ جاتا ہے۔ پر یہ دُکھ جائے گا تو کبھی نہیں "۔

کتبہ ابرار حسین جھنجھانوی